آگ کے اندر راکھ

(افسانوی مجموعہ)

عبدالصمد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

آگ کے اندر راکھ

عبدالصمد

☆ اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا مالی تعاون شامل ہے۔

☆ کتاب میں شائع مواد سے بہار اردو اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆ کسی بھی قابلِ اعتراض مواد کی اشاعت کے لئے خود مصنف/مرتب ذمہ دار ہے۔

آگ کے اندر راکھ

(افسانوی مجموعہ)

عبدالصمد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

ترتیب

جلی ہوئی کشتی کا سفر

گاڑی نے اسے پرانے، شکستہ، بوسیدہ اسٹیشن پر کسی طرح لا کر اگل دیا ہے۔

اس کے ساتھ کئی ٹرنک اور سوٹ کیس ہیں، پلاسٹک اور پولیتھن کے بہت سے تھیلے بھی۔ قلی اور ساتھ کے کئی مسافروں نے مدد کی۔ تب کہیں سارا سامان اتر سکا ورنہ گاڑی اور اسٹیشن کی جو زبوں حالی ہے اس کے پیش نظر یہ کام آسان نہیں تھا۔ وہ ٹیکسی سے بھی آ سکتی تھی لیکن اصل میں یہاں تک آنے کے لئے باقاعدہ کوئی سڑک ہے نہیں، درمیان ایک دو ایسی ندی پڑتی ہے جسے پاٹنے کی بات وہ بچپن سے سنتی آئی ہے لیکن وہ ندی کو جس حال میں چھوڑ کر گئی تھی اسی حال میں وہ آج بھی بہہ رہی ہے۔ جو بچے ریل کے پل سے اس میں چھلانگ لگایا کرتے تھے، آج بھی لگا رہے ہیں۔ جو لوگ اس میں کمر کمر اندر جا کر کیچڑ میں اٹی مچھلیاں پکڑتے تھے، آج بھی پکڑ رہے ہیں۔

اسٹیشن پر اسے جاننے والا کوئی نہیں ہے، پہلے بھی نہیں تھا۔ اس نے یہاں آنے کی کسی کو اطلاع بھی نہیں دی ہے۔ یوں بھی جب سے وہ گئی تھی رشتوں کے درمیان آ پڑنے والی رسومات کو اس نے ایک دم فراموش ہی کر ڈالا۔ خاندان میں، گھر میں، شادیاں ہوئیں، موتیں ہوئیں اس نے کسی کو مبارکباد دی نہ تعزیت کے دو حرف لکھے۔ بس وہ سب کی ضرورتیں پوری کرتی رہی۔ وہ پہلے بھی جانتی تھی، اب بھی جانتی ہے کہ رسومات کی تکمیل سے وہ نہ کسی کی محبوب بن جائے گی اور نہ کرنے پر اسے کوئی برا سمجھے گا۔ وہ یہاں رہنے کے ارادے سے آئی بھی نہیں ہے۔ اس کے پاس واپسی کا ٹکٹ موجود ہے۔ جن لوگوں نے اسے یہاں آنے کی اجازت دی ہے ان کے اعتماد بھی اس کی گرہ میں مضبوطی سے بندھے ہیں۔ یہاں سے اس کا گاؤں کوئی دس کیلومیٹر کی دوری پر ہوگا۔ کیلومیٹر بھی وہ سوچ رہی ہے ورنہ یہاں تو کوس، گز اور بانس کا حساب چلتا تھا اس وقت زیادہ تر لوگ

اپنے سامان پیٹھ پر لادے پیدل آتے یا پھر سامان ڈھونے والا رکشا ہوتا، جس پر وہ لوگ بھی جاتے۔ دوایک یکے ضرور تھے لیکن بہت مہنگے، انہیں استعمال کرنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔

ٹرین جا چکی تو اس نے دو قلیوں کی مدد سے اپنا سامان باہر لایا اور ایک یکے پر انہیں لاد دیا۔ یکے والے نے غور سے اس کی طرف دیکھا لیکن شاید پہچان نہیں سکا۔ اس میں تبدیلی بھی تو بہت آ گئی ہے۔ شکل وصورت، رنگ و روغن، لباس، چال ڈھال...... کہیں پر سے بھی تو وہ، وہ چندا نہیں ہے۔ پتہ نہیں گھر والے بھی اسے پہچان سکیں گے یا نہیں......؟

وہ یکے والے کو پہچانتی ہے...... بڑھکن دادا......

مگر وہ مصلحتاً خاموشی ہی اختیار کرتی ہے۔ اسے چلنے کو بھی کہا تو صرف گاؤں کا نام لیا، ڈیوڑھی کا نہیں۔ پتہ نہیں لوگوں نے وہاں اس کے بارے میں کیا کیا سوچ رکھا ہے۔ راستے سے اندازہ ہو رہا ہے کہ کہیں کوئی خاص فرق نہیں آیا ہے۔ اسے تو صورت حال کچھ ابتر ہی نظر آ رہی ہے۔ ویسی ہی اکھڑ کھابڑ پگڈنڈیاں، دھول اور گرد سے بھرے ہوئے راستے، جا بجا اتنے بڑے بڑے گڑھے کہ یکہ کئی بار الٹتے الٹتے بچا۔ وہ مضبوطی سے یکے کو دونوں ہاتھوں سے تھامے نہیں رہتی تو اس کا گر جانا یقینی تھا۔ وہ اس کی عادی بھی تو نہیں۔ لیکن جب وہ یہاں تھی تب کون سی یکے پر بیٹھتی تھی۔ شاید اسی لئے وہ کسی قسم کے **Nostalgia** کے گرداب میں نہیں پھنس رہی ہے اور ہر قسم کے احساسات سے عاری ہو کر اپنے گھر جا رہی ہے۔

بس اپنے گھر......

اس گھر میں جہاں سے وہ ایک دن بھاگ نکلی تھی کیوں کہ اس کے گھر کے در و دیوار نے محبت اور اپنائیت کی بانہوں میں اسے جکڑنے سے انکار کر دیا تھا۔

غربت، افلاس اور غیر یقینی مستقبل کی زرد پرچھائیاں......

نحس اثرات کے نتیجے میں وہ تمام چیزیں غائب ہو گئی تھیں جو انسان کو پیروں کی بیڑیوں میں جکڑے رکھتی ہیں اور انسان بہت کچھ چاہ کر بھی کچھ کر نہیں پاتا۔ اس نے اپنے وجود کو ایک بوجھ کی شکل انو بھو کیا تھا۔ جس کے دباؤ سے ہر آدمی کی پیشانی پر ابھری ابھری سلوٹیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بھاگ جائے، مر جائے یا اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جائے تو کہیں پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ زیادہ سے زیادہ ماں رو لیتی، وہ بھی اندر اندر دو چار آنسو اس کی میلی،

پرانی، ملگجی ساڑی میں جذب ہو جاتے۔ یہاں سے جانے کے بعد لمبی لمبی خط و کتابت کا سلسلہ اس نے رکھا ہی نہیں۔ یہاں سے اس کے پاس جو لمبے لمبے خط گئے، شادی، بیاہ، غم وغیرہ کی اطلاعات گئیں، انہیں پڑھے بغیر وہ ایک طرف کو ڈالتی گئی۔ زیادہ ہو گئے تو خاموشی سے کوڑے دان میں ڈال دیا۔ جانتی تھی کہ کسی کو مبارکباد دینے سے کسی کے دل کی کلی کھلے گی اور نہ تعزیت کرنے سے کسی کا زخم مندمل ہوگا۔

وہ اپنے آپ کو وہی چندا مان کر چلی جو برسوں پہلے اس گاؤں میں پیدا ہوئی تھی۔ جوان ہوئی تھی لیکن خوشی یا غم کے کسی موقع پر اس کے وجود کو کبھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ اب اس کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کے سبب کسی کے وجود کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ تو پھر وہ اس بات پر کیوں مصر رہے کہ ماننا ہے تو اس کے اسی وجود کو تسلیم کیا جائے جب...... حالانکہ یہ بات اس نے کسی پر ظاہر نہیں کی ہے لیکن یہ بات اس کے اندر کی چہار دیواری میں پلتے پلتے اتنی جوان ہو چکی ہے کہ اب اس کی خوشبو باہر بھی پھیلنے لگی ہے۔

خیالوں میں گم، دھکچے کھاتی ہوئی، ٹکٹکی باندھے وہ اس راستے کو دیکھے جارہی ہے جو اسے کشاں کشاں اس کے گھر کی طرف لے جارہا ہے۔ وہ خیالوں کے ہجوم میں گھری ہوئی ہے لیکن اس کے دل میں کوئی ہلچل نہیں۔ ایک خاص قسم کا اشتیاق جو بہت دنوں پر جانے میں ہوتا ہے، دور دور تک اس کا پتہ نہیں۔ وہ جب وہاں سے چلی، اس سے بہت پہلے اس نے یہاں آنے کا پروگرام بنایا، اتنا طویل راستہ طے کیا۔ پھر بھی اس کے اندر وہ چیز پیدا نہیں ہو سکی۔ پھر وہ یہاں آنے کے لئے اتنی بے چین کیوں تھی......؟

سہیلیوں سے وہ یہاں آنے کا ذکر اتنی شدت سے کیوں کرتی تھی......؟

جب بھی یہاں آنے کی بات ہوتی تو اس کے جوش و خروش میں اتنا اضافہ کیوں ہو جاتا تھا......؟

کہاں گئیں وہ سب باتیں......؟

کہاں سے آتی تھیں وہ سب باتیں......؟

اس کے پاس تو جیسے کچھ باقی ہی نہیں بچا...... کوئی جذبہ نہیں، کوئی احساس نہیں، وہ اپنے گوشت پوست کے زندہ ڈھانچے کو بس ایک سمت ہانکے جارہی ہے۔

بڑھکن دادا بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس کے جسم پر رعشہ طاری ہے لیکن چابک پر گرفت ابھی تک مضبوط ہے جسے وہ بار بار ہوا میں لہرا کر گھوڑے کو دوڑا رہا ہے۔ مدقوق گھوڑا خوف سے ہانپتا، کانپتا، گرتا پڑتا بھاگا جا رہا ہے...... بڑھکن دادا نے اپنی بجھی بجھی آنکھوں سے کئی بار اس کی طرف دیکھا لیکن شاید نہیں پہچاننے کے سبب خاموش ہی رہا۔ وہ چاہے تو بس ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے اس کی ساری الجھن دور کر سکتی ہے اور اپنے گھر، گاؤں کے ایک ایک فرد، ایک ایک ذرّے، ایک ایک پتّے کا حال چال معلوم کر سکتی ہے۔ وہ بڑھکن داد کو ایک خوش گوار دھکّے سے دوچار کر سکتی ہے لیکن نہیں......

وہ یہ سب کچھ نہیں کرے گی......

بے سمت کے جس سفر کو اس نے اختیار کیا ہے، اسے وہ کوئی نیا موڑ نہیں دے سکتی، اس سے کسی کو فائدہ بھی کیا، وہ جس راستے پر چل پڑی ہے اس سے اسے واپس تھوڑی آنا ہے۔

بڑھکن دادا نے ہلکے ہلکے سروں میں ایک گیت گنگنانا شروع کر دیا ہے۔ اس کے بول اس کے کانوں میں نہیں پہنچ رہے۔ پہنچ بھی جائیں تو اس کی سمجھ میں تھوڑی آئیں گے۔ لیکن گیت کا سُر اسے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اس کے جسم میں ایک عجیب قسم کی سنسناہٹ دوڑ رہی ہے۔ ایک سرور کی کیفیت اسے چاروں اور سے دھیرے دھیرے گھیر رہی ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہونا چاہتی ہیں۔ بند ہو کر اس عجیب و غریب سرور سے پیدا شدہ منظر کو وہ بہ نفس نفیس دیکھنا چاہتی ہیں...... لہلہاتے ہوئے کھیت، ہری بھری بالیاں، جھڑی لگانے والے بادل، مدہوش کر دینے والی ہوائیں، کانوں میں موسیقی گھولنے والے جھرنے، بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتے پہاڑ، پتوں سے سرگوشیاں کرتی ہوئی بادِ نسیم......

گیت کا بے ڈھنگا سُر اس کی سمجھ میں ہرگز نہیں آ رہا ہے لیکن اس کی بند آنکھوں کے سامنے ایک معنی خیز منظر پیش کر رہا ہے......

اسے اپنے وجود کا احساس دلا رہا ہے......

یہاں آنے کا پروگرام بہت دنوں سے بن رہا تھا۔ راہ میں آنے والی بے شمار دشواریوں کو اس نے کس کس جتن سے پار کیا اور بہت مشکلوں سے کامیاب ہو سکی۔ بڑھکن دادا کے گیت کے اجنبی سروں کے پیدا ہونے سے پہلے وہ یہاں آنے کے اپنے مقصد کو کوئی واضح شکل دینے میں

ناکام رہی لیکن اب اس کے سامنے معنی کی ایک بالکل نئی دنیا اچانک آ کھڑی ہوئی ہے۔ اسے محسوس ہو رہا ہے کہ کوئی نامعلوم ہاتھ اس کے وجود کے ایک ایک راز کی گتھیاں کھول رہا ہے۔ ساری باتیں اس کی سمجھ میں آ رہی ہیں۔ اسے کسی نے باقاعدہ پڑھایا نہیں ہے۔ وہ ایک ایسی کتاب ہے جو کپڑوں میں لپٹی بند پڑی تھی اور بند بند یہاں سے وہاں اور وہاں سے کہاں پہنچ گئی اور اب اتنے دنوں کے بعد واپس آئی تو اسے کھولا بھی کس نے......؟

بڑھکن دادا نے......

اسے ہنسی آ جاتی ہے۔

بڑھکن دادا نے ایک جان لیوا وقفے کے بعد پھر گنگنانا شروع کر دیا وہ پھر ٹرانس میں چلی گئی۔ دس کلومیٹر کا مختصر فاصلہ طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس راستے کو جلد ہی ختم ہونا ہے پھر بھی وہ اسے طول دینے کی زبردست خواہش رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں اس کے اندر جو بھی قوت ہے وہ اس کا استعمال کرنے سے ہچکچائے گی نہیں۔ بڑھکن دادا کے سُر سے جو منظر پیدا ہوا ہے وہ اس میں مکمل طور پر ڈوب جانا چاہتی ہے۔ اس نے اتنی عمر میں کافی دنیا دیکھ لی ہے لیکن یہ دنیا......

یکہ آبادی میں داخل ہو رہا ہے۔ سارا منظر اور پورا ماحول اس کا بے حد جانا پہچانا ہے۔ مکانات، گلیاں، نالے، کوڑے کے انبار، گھوروں پر خوش فعلیاں کرتے مرغ مرغیاں...... کہیں کہیں کچھ نئی تعمیر بھی ہوئی ہے۔ پرانے مکانوں میں کچھ اضافے کئے گئے ہیں کچھ گھروں پر نئے رنگ و روغن بھی دِکھ رہے ہیں۔

بڑھکن دادا کی گنگناہٹ بستی میں داخل ہوتے ہی ختم ہو گئی اور وہ کھردرے لہجے میں اس کے دروازے کا پتہ پوچھ رہا ہے لیکن اب اس کے اندر اتنی توانائی آ چکی ہے کہ وہ کسی بھی صورت حال کا سامنا کر سکتی ہے۔ اس نے بہت ہی خوش مزاجی سے اپنے دروازے کا پتہ بتلایا۔ بڑھکن دادا بہت زور سے چونکتا ہے اور منھ ہی منھ میں کچھ بڑبڑانے لگتا ہے۔ اسے کسی بات کی پرواہ نہیں وہ بالکل بے نیاز سی بن گئی ہے۔ اس کا رویہ اس مسافر جیسا ہو گیا ہے جو بہت دنوں بعد گھر لوٹ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر پسینے کی جو بہت ہلکی نظر نہیں آنے والی بوندیں ابھر آئی ہیں وہ اس کے اندرونی جوش خروش کی برملا علامت ہیں۔

بڑھکن دادا نے یکے کو چند ٹیڑھے میڑھے راستے سے گزار کر ایک اجنبی ڈیوڑھی پر لا کر روک دیا ہے۔ باہر کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیتا۔ صرف ایک پراسرار، اجنبی مکان کھڑا ہے جس کے در و دیوار پر اس کا نام کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

وہ غور سے...... بہت غور سے مکان کو دیکھتی ہے تو اسے دکھائی دیتا ہے کہ اس کی جو ٹوٹی ہوئی دیواریں تھیں وہ سب کی سب نئی، اجنبی اور جابر دیواروں میں چن دی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ اس کی اپنی پہچان بھی اندر اندر دفن ہو گئی ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے پرانی بوسیدہ دیواریں اسے آواز دینا چاہتی ہیں لیکن ان آوازوں کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ ''تم ضمرو میاں کی بٹیا ہونا......؟''

بڑھکن دادا اسے پس و پیش میں دیکھ کر عجب لہجے میں پوچھتا ہے، وہ بڑے زور سے چونکتی ہے۔ بڑھکن دادا کے الفاظ ایک گہرے مٹکے سے نکلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ بے بسی کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیتی ہے۔ بڑھکن دادا کے چہرے پر فتح یابی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے، اس کے منھ سے بس یہی نکلتا ہے۔

''وہی تو......''

دراصل اسے پتہ ہی نہیں کہ یہاں سے جانے کے بعد گھر گاؤں میں کیا کچھ ہوا۔ اس کے بارے میں کیا سوچا گیا، کیا کہا گیا، بڑھکن دادا گاؤں کا ایک معمر فرد ہے، اس نے اور اس جیسے دوسرے افراد نے اس چیز کو کیسے قبول کیا......؟ کچھ پتہ نہیں۔

اس نے مکان کو ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ اس کے بھیجے ہوئے پیسوں سے مکان کی وہ اپنائیت چھپ گئی ہے جو اتنے دنوں تک اس کے دل میں چمکتی رہی ہے۔ اس کے قدم یہاں یوں اترے ہیں جیسے کسی ہوٹل میں جا اتریں اور ہوٹل تو اس نے دنیا بھر کے دیکھ رکھے ہیں۔ اس کی زندگی کا تعلق اب ہوٹل ہی سے جڑا ہوا ہے۔ اسے یوں بھی اب کہیں گھر نظر نہیں آتا' صرف ہوٹل دکھائی دیتا ہے۔

اسے اچھی طرح یاد ہے، جب بھی اس کے گھر یا کسی دوسرے کے گھر کوئی سواری اترتی تو منٹوں میں گاؤں کے سارے بچے وہاں جمع ہو جاتے۔ بہت سے بڑے بھی چلتے چلتے رک جاتے۔ مہمان کسی کے گھر اترے، خوشبو سارے گاؤں میں پھیلتی اور سب اس وقت تک اسے

گھیرے رہتے جب تک کہ وہ اندرون خانہ نہیں چلا جاتا..... اسے آئے ہوئے اتنی دیر ہو گئی لیکن کوئی چڑیا بھی کہیں سے اڑ کر آتی دکھائی نہیں دیتی۔

بڑھکن دادا ہانپتے کانپتے اس کا سارا سامان نیچے اتار دیتا ہے۔ وہ اپنا پرس کھول کر اس میں سے سوسو کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتی ہے۔ بڑھکن دادا خشم گیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ لجاجت سے کہتی ہے۔

''رکھ لو دادا.....''

بڑھکن دادا کے چہرے پر کچھ عجب سے تاثرات ابھرتے ہیں، اس کا ہاتھ آگے نہیں بڑھتا، وہ منہ ہی منہ میں بدبدا کے کہتا ہے۔

''جو میری مجوری ہے وہی دو..... میں فجول پیسے نہیں لیتا.....''

وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں پاتی، کچھ کہنے کی اس کے اندر ہمت ہی نہیں جٹی۔ بڑھکن دادا کی آنکھوں اور چہرے کے اتار چڑھاؤ میں وہ جو کچھ پڑھ رہی ہے۔ اس سے اس کو اپنی کم مائیگی کا اچانک اور شدید احساس ہوتا ہے، وہ چپ چاپ ''مناسب مجوری'' پوچھ کر بڑھکن دادا کو دیتی ہے۔ کوئی تاثر ظاہر کئے بغیر وہ منہ پھیرے واپس چلا جاتا ہے۔ وہ سامان وہیں چھوڑ کر گھر کا بند دروازہ دھیرے سے کھولتی ہے۔ پورا گھر اچانک اس کے سامنے آجاتا ہے۔

چاروں طرف سائبان بن گیا ہے۔ کمروں پر کھادی کے پردے لہلہا رہے ہیں۔ آنگن میں تین طرف اونچی منڈیریں بن گئی ہیں جن پر پھولوں کے گملے رکھے ہیں۔ سائبان کے ایک کونے پر باتھ روم ہے جس کے ٹین کے دروازے پر چاک سے ''غسل خانہ'' لکھا ہے۔ آنگن کی زمین کچی ہے لیکن اسے تھوپ تھوپ کر پتھریلا سا بنا دیا گیا ہے۔

یہ وہ گھر ہر گز نہیں جسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ بوسیدہ، تاریک، گھٹن اور مایوسی سے اٹا ہوا۔ اگر آنکھیں بند کر کے اچانک اسے اس آنگن میں اتار دیا جاتا تو وہ ایک دم سے گھبرا جاتی اور اسے ہر گز نہیں پہچان سکتی۔ ابھی بھی وہ صرف ان پیسوں کو پہچان رہی ہے جنھیں وہ سمندر پار کے دور دیسوں سے بھیجتی رہی ہے۔

اماں، ابّا کے چہروں پر اچانک اسے یہاں دیکھ کر جو روشن لہریں ابھرتی ہیں وہ دراصل حیرت، خوشی اور اضطراب کے ملے جلے تاثر سے گندھی ہوئی ہیں۔ ان کے جسموں پر صاف

ستھرے کپڑے ہیں اور ضعیف آنکھوں میں آسودگی اور اطمینان کے آثار...... وہ انہیں جھک کر سلام کرتی ہے۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے گلے لگالیتے ہیں۔

''آنے کی خبر تو دی ہوتی......؟''

باپ کا لہجہ شفقت سے بھرپور ہے۔ اماں اس کی طرف سے کم اور اپنی طرف سے زیادہ جواب دیتی ہیں۔

''خبر کیا دیتی......؟ دو حرف خیریت کا تو کبھی لکھا نہیں......''

اتنی دیر میں وہ چھوٹی بہنوں کو گلے لگا چکی تھی۔ بہت اپنائیت سے اماں کو جواب دیتی ہے۔

''فرصت ہے اماں......؟ سر کھجانے کی تو مہلت ہی نہیں ملتی، بس سمجھئے کہ مشین......''

''یہاں اتنی غمی خوشی ہوئی، ہم اتنے بیمار پڑے، دو حرف اپنی خیریت ہی کا لکھ دیتیں......''

اماں اب کھل کر شکایت کرتی ہیں۔

وہ جن حالات میں یہاں سے گئی تھی اس کا تو کہیں دور دور ذکر نہیں۔ کنواری لڑکی کا گھر سے بھاگنا کس قدر معیوب اور شرمناک بات ہے۔ یہ بات وہ خود کبھی نہیں بھولی۔ اس کو پکا یقین تھا کہ ان لوگوں نے اسے مردہ سمجھ کر صبر کرلیا ہوگا۔ زندہ ہونے کی ایک موہوم سی امید باقی ہوگی تو بھی گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی مردہ ہونے کے برابر ہی ہے۔ وہ تو جب اس نے پیسے بھیجنے شروع کئے تب اسے یہاں زندہ محسوس کیا گیا۔ لیکن گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی شرم اور بدنامی کی ایک زندہ مثال تو بن ہی جاتی ہے اور یہ تو وہ بن ہی گئی ہے۔ یہ بات انہیں ہمیشہ کچوکے لگاتی ہوگی......''

لیکن نہیں...... یہاں تو دور دور ایسی کوئی بات نہیں۔

اس نے یہاں آنے کا قصد کیا تھا تو اسی لمحہ اس نے اپنے جسم پر ایک ایسا زرہ ڈال لیا تھا جس کو ہر چہار طرف سے تیر برداشت کرنے تھے۔ شاید اسی لئے لائف لائن کے طور پر اس کے پاس واپسی کا کنفرم ٹکٹ بھی تھا۔ لیکن یہاں تو......

لوہے کا زرہ خود اس کے لئے بوجھ بن چکا ہے۔ چھوٹے بڑے سب اس سے دور دراز کے ملکوں اور شہروں کا بہت تجسس اور شوق سے حال دریافت کر رہے ہیں۔ ان کے چہرے اور آنکھوں میں خوشی کی لہریں موجیں مار رہی ہیں۔ ان کی پٹاریوں میں دنیا بھر کے بے شمار سوالات

ہیں...... لیکن صرف دو سال......

اس کے جانے کے بارے میں......

اس کے آنے کے بارے میں......

وہ دل ہی دل میں ان کی احتیاط اور اس سے جڑے ہوئے ممکنہ ڈر سے لطف لیتی ہے اور خوب ہنستی ہے...... دل ہی دل میں......

پٹاری کے ان دو سانپوں کو اس نے خود ہی نکالنا چاہا تھا لیکن یہ سوچ کر رک گئی کہ بہت سے معاملات پر پردہ پڑا رہنا ہی مناسب ہوتا ہے اور اس کے سہارے زندگی بھی بڑے آرام سے کٹ جاتی ہے۔ وہ لوگ بڑے آرام سے اپنی زندگیاں جی رہے ہیں اور اسے حق نہیں پہنچتا کہ ان کے ٹھہرے ہوئے پرسکون پانی میں خواہ مخواہ پتھر پھینکے۔

اس نے اپنی کشتیاں جلا ڈالی ہیں پھر بھی وہ لوٹ کر آئی ہے۔ انہوں نے اپنی کشتیاں تیز دھار پر ابھی ڈالی ہیں۔ یہ کشتیاں انہیں کہاں اتاریں گی۔ یہ بات تو انہیں خود بھی پتہ نہیں ہوگی۔ ان کا معاملہ وہ جانیں۔ اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ جس کنفرم ٹکٹ سے آئی ہے، اسی سے واپس لوٹ جائے۔

واپسی کا دن آسمان کے بحرِ بے کراں پر ڈولنے لگا ہے۔ ایسا نہیں کہ کسی نے اسے روکا نہیں، سب نے روکا۔ اماں کی زبان پر کبھی نہیں جانے کی بات بھی آئی۔ ابّا نے بھی ابھی نہیں جانے کی بات کہی، چھوٹے جانے کا سن کر مچل اٹھے لیکن اسے محسوس ہوا کہ اس کے جانے کا سننے کو سب بہت بے چینی سے منتظر تھے۔

اس نے مسکرا کر انہیں بتایا کہ غیر ملک میں اس کے کاندھوں پر اتنی ذمہ داریاں ہیں کہ اس کا وہاں سے ایک لمحے کے لئے بھی ہٹنا مشکل ہے۔ ان کی محبت میں وہ اتنے دنوں کے لئے یہاں آگئی۔ اب اس کا جانا ضروری ہے۔

"قربان جاؤں اس مالک دو جہاں کے...... اس نے مجھے ایک ایسی بیٹی عطا کی جو سینکڑوں بیٹوں پر بھاری ہے۔ اے مالک......! تو سب گناہ گاروں کو ایسی ہی صالح اور نیک اولاد دے، تو بڑا کارساز ہے......" وہ بڑی سعادت مندی سے مسکراتی ہے۔

واپسی میں وہ بہت ہلکی پھلکی ہے۔ سارا سامان گھر چھوڑ آئی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے

سوٹ کیس بھی۔ اب اس کے ساتھ صرف دو تھیلے ہیں یہ بھی نہ ہوتے اگر اماں حلوہ، خرمی اور کلچوں کے لئے ضد نہ کرتیں۔ انہوں نے بڑے چاؤ سے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ ہزار نہیں چاہنے پر بھی وہ انہیں ساتھ لے جانے پر مجبور ہوگئی۔ ابّا نے اسٹیشن جانے کے لئے ٹیکسی منگوانی چاہی جسے شہر جا کر لانا پڑتا۔ لیکن اس نے سختی سے منع کر دیا اور واپسی کے لئے بڑھکن دادا کے یکے ہی کو منتخب کیا۔ اس نے کسی کو اسٹیشن بھی نہیں جانے دیا حالانکہ اسے رخصت کرنے کے لئے اماں ابّا تک جانے کو تیار تھے لیکن وہ اپنی بات پر اس طرح اڑی کہ سب کو جھکنا ہی پڑا۔

آنسوؤں کی جھڑی اور دعاؤں کے سائے میں وہ روانہ ہوئی۔

بڑھکن دادا کی بے نیازی اور اکھڑ اپن اپنی جگہ پر ہے۔ اس نے پچھلی بار اس پر جو خشم گیں نگاہ ڈالی تھی وہ ابھی تک اس کے پورے جسم میں سرسرا رہی ہے۔

بڑھکن دادا نے گاؤں کے اُبڑ کھابڑ راستے پر آتے ہی پھر وہی گیت الاپنا شروع کر دیا جس کے سہارے اس کا سفر بہت آسانی سے طے ہو گیا تھا۔

وہی گیت اب پھر اس کی مدد کر رہا ہے...... واپسی کے سفر میں...... گیت بھی نہیں صرف اس کے سُر، کیوں کہ گیت کے الفاظ کو سمجھنے سے تو وہ قاصر ہے۔

وہ پھر اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی ہے۔ نیند کے دھیمے ہلکورے...... وہ کسی مہربان اور شفیق گود میں سر رکھ کر سو جانا چاہتی ہے...... نیند...... گہری نیند......

لیکن ہر خواہش تو پوری نہیں ہو جاتی، یوں بھی اس کی کون سی خواہش پوری ہوئی ہے۔ وہ تو بے پایاں سمندر میں بہتا ہوا ایک ایسا تنکا ہے جسے سمندر نے ابھی تک ڈبویا نہیں اور یوں بہتے رہنے میں اس کی اپنی مرضی کا کوئی دخل نہیں۔

بڑھکن دادا کا گیت ختم ہوتے ہوتے اسٹیشن آ گیا۔ اس کے اندر اچانک یہ خواہش جاگ اٹھی کہ وہ بڑھکن دادا کو پھر واپس چلنے کو کہے، اس لئے نہیں کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے...... بلکہ ایک بار پھر وہ اس گیت کے سُر کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اتار لینا چاہتی ہے۔ لیکن بڑھکن دادا نے بہت تیزی کے ساتھ اس کے تھیلے اتار دیے اور اسے حیران چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ مزدوری اسے ابّا پہلے ہی دے چکے تھے۔

وہ کچھ دیر تک وہاں چپ چاپ کھڑی کچھ سوچتی رہی۔ سامنے اسٹیشن کی پرانی، بوسیدہ

عمارت تھی۔ گاؤں کا وہ اکھڑ کھابڑ راستہ بہت دور چھوٹ گیا ہے جسے طے کر کے وہ ابھی ابھی یہاں تک پہنچی ہے۔

اس کے اندر سے ایک عجیب وغریب اور اندر اندر گھٹ کر رہ جانے والی آہ ہونٹوں پر آتے آتے رہ جاتی ہے، وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے، اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے قلی سے اپنے تھیلے اٹھواتی ہے اور سر جھکاتی ہوئی سوسومن کے قدموں کے ساتھ پلیٹ فارم کی طرف بڑھ جاتی ہے۔

اس کی گاڑی اب آیا ہی چاہتی ہے۔

✠ . ✠ . ✠

جائے اماں

بابو جی نے پیروں کی ٹھوکر سے دروازے کو کھولا جو اندر سے بند نہیں رہتا تھا اور اندر داخل ہو کر انہوں نے چٹخنی چڑھا دی جس کی قطعاً ضرورت نہیں تھی، خوف زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا جو ان کا ایک غیر معمولی عمل تھا اور آرام کرسی پر نیم دراز ہو کے آنکھیں بند کر لیں۔

ان کے معمول میں تبدیلیوں کو ہم کئی روز سے نوٹ کر رہے تھے اور ہمیں اس کا احساس ہو رہا تھا کہ ضرور ان کے ساتھ کچھ غیر معمولی واقعات پیش آ رہے ہیں لیکن ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت کس میں تھی۔ کبھی کھاتے کھاتے وہ بے خیالی میں پانی کا گلاس اٹھا لیتے، جب کہ کھانے کے دوران پانی پینے کے وہ سخت مخالف تھے، کبھی پلیٹ میں کچھ کھانا بچ جاتا تب ہی وہ اٹھ جاتے جب کہ ایسا کرنا ہمیشہ سے انہیں ناپسند تھا۔ راتوں کو اٹھ کر ٹہلتے ہوئے یا بند دروازے کو پھر سے بند کرتے ہوئے ہم نے انہیں کئی بار دیکھا تھا۔ ہم آپس میں اس موضوع پر سوچ بچار تو بہت کرتے لیکن کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رہتے۔

تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں، ہمیں غور سے دیکھا اور دھیرے سے پوچھا۔

''راجو آیا تھا کیا......؟''

''نہیں تو......''۔

ہم نے کورس میں صریحاً جھوٹ بولا۔ راجو صبح ہی ان کی غیر موجودگی میں آیا تھا۔ وہ پھر سوچ میں ڈوب گئے۔ راجو کی آمد کو ہم نے ان سے پوشیدہ رکھنا شروع کر دیا تھا۔ دراصل اسے دیکھتے ہی ان کا موڈ خراب ہو جاتا اور اس وقت تک خراب رہتا جب تک کہ وہ چلا نہیں جاتا۔ بابو

جی کے کڑوے پن کا اسے بھی احساس تھا اس لئے اس کی موجودگی میں بابو جی آ جاتے تو اس کا چہکنا ایک دم سے دھیما پڑ جاتا اور وہ جیسے تیسے اپنی لچھے دار باتوں کو مختصر کر کے چپ چاپ چلا جاتا۔اس کی خاموش بے عزتی کا ہمیں بہت احساس تھا لیکن ہم کیا کر سکتے تھے۔اس کے جاتے ہی وہ ہم پر پل پڑتے۔

''کیوں آتا ہے یہ راکشش یہاں......؟ میں بار بار منع کرتا ہوں،تم لوگ سنتے ہی نہیں، کیوں سب بیٹھے رہتے ہیں اسے گھیر کے......؟''

''اب وہ آتا ہے تو ایک دم سے اسے کیسے منع کر دیا جائے......؟ آخر کو وہ آپ کا سگا بھانجا ہے......''۔

ماں دبی زبان سے کہتیں''جہنم میں گیا ایسا بھانجا...... جگ میں اس نے ہماری ناک کٹوا دی،خاندان کی عزت پر بٹہ لگا دیا،اب اس سے ہمارا کیسا سمبندھ......؟''

جب وہ خود اتنے قریبی رشتے کو ماننے کو تیار نہیں تھے تو آگے ان سے کیا بات کی جاتی۔ یوں بابو جی بھی کچھ غلط نہیں تھے،راجو نے واقعی ان کے خاندان کا نام روشن نہیں کیا تھا۔ماں باپ کا اکلوتا،پیسے اور وسائل کی کمی نہیں،بہتر سے بہتر تعلیم دلانے کی بہت کوشش کی ئی لیکن ماں باپ سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے شروع سے اپنی آنکھوں پر لاڈ پیار کی پٹی باندھ رکھی تھی،خیر اس نے نہیں پڑھا تو نہیں پڑھا،اس کا رجحان مجرمانہ ڈگر کی طرف مڑ گیا۔اس کے دولت کی کشش سے چاروں طرف غلط کاروں کا ایک ہالہ سا بنتا گیا اور اسے خود دادا کہلانے کا شوق...... چھوٹے چھوٹے جرائم کی سربراہی میں ایک آدھ بار پکڑ میں آیا تو باپ کی دوڑ دھوپ سے چھوٹ گیا۔اس سے اس کی ہمت بڑھتی گئی۔گرگوں پر دھاک بھی جمی،پھر وہ ایسے جرائم کی طرف مڑ گیا جس میں پکڑ آسان نہیں ہوتی،وہ یوں بھی اتنا بارسوخ ہو گیا کہ دوسروں کو پکڑ سے بچانے لگا۔

بابو جی ٹھہرے شروع سے سدھانت وادی،مزاج میں کچھ قناعت شروع سے تھی،کچھ حالات نے لاد دیا تھا،وہ جس دروازے کی طرف بڑھتے،وہ ان کے آتے آتے بند ہو جاتا۔ان کے اندر اتنی طاقت تھی نہیں کہ اس ٹھوکر سے اسے کھول دیں جس ٹھوکر سے انہوں نے اپنے خستہ حال مکان کے بوسیدہ دروازے کو کھولا تھا۔بہت اونچے گئے تو ایک سرکاری دفتر میں بڑا بابو ہی بن سکے۔فائلوں پر ایسے نوٹ لکھتے کہ بڑے صاحب لوگ اسے چپکے سے اپنی ذاتی ڈائری میں

نقل کر لیتے۔ ریکارڈ یہ رہا کہ جو نوٹ انہوں نے لکھ دیا، وہ اوپر سے اوپر جا کر کبھی رد نہیں ہوا۔ ان کے لکھے ہوئے نوٹ اہم اور اونچے فیصلوں کی بنیاد بنتے، چیف منسٹر اور پرائم منسٹر تک ان کی قدر ہوتی۔ ویسے ان کے لکھے ہوئے نوٹ پر دستور کے مطابق کسی بڑے صاحب کا دستخط ہو جاتا تو وہ بڑے صاحب ہی کا نوٹ کہلاتا، اس پر جب منتری جی اپنا ہستا کچھر کر دیتے تو وہ منتری جی کا نوٹ بن جاتا، یہی نوٹ جب......

بابو جی اپنے لکھے ہوئے نوٹ پر فائنل دستخط دیکھتے تو پھولے نہیں سماتے اور بہت فخر سے بہت دنوں تک اس کا ذکر کرتے رہتے۔ ان کے ساتھی سنگت ان کی خوشی میں کہاں تک شریک ہوتے تھے، یہ تو ہمیں نہیں پتہ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ان پر بہت رحم آتا تھا کیوں کہ ہمیں یہ اچھی طرح پتہ تھا کہ نوٹ تو ہمیشہ کلرک ہی لکھتے ہیں، دستخط بڑے صاحب کرتے ہیں، اس میں خوش ہونے والی کون سی بات ہے۔

کافی دیر تک آنکھیں بند کئے وہ پڑے رہے۔ ان کی ذہنی کیفیت ان کی پیشانی کی لکیروں سے آشکارہ تھی، ہم سب ڈر گئے۔ کہیں راجو نے انہیں کوئی نا قابل برداشت دھکا تو نہیں دے دیا......؟ اچھا ہی ہوا جو ہم نے اس کے متعلق جھوٹ کہہ دیا ورنہ بابو جی کو پتہ نہیں اور کتنی تکلیف پہنچ جاتی۔ بابو جی کی یہ حالت دیکھ کر ہم نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ راجو کی آمد کو ان سے ہمیشہ پوشیدہ رکھیں گے۔ کم بخت کی شخصیت اور باتوں میں یقیناً کوئی ایسی نا قابل تفہیم کشش تھی جو وہ ہمیں خواہ مخواہ اچھا لگتا۔

راجو بچپن ہی سے ہمارے گھر آتا تھا۔ بابو جی اسے پیار بھی کرتے لیکن جب سے اس کی سرگرمیاں شروع ہوئیں اور لوگوں نے انہیں دبی زبان سے ٹوکنا شروع کیا، وہ اس سے بدکنے لگے، وہ انہیں نمسکار کرتا تو کوشش کرتے کہ سیدھے منہ جواب نہ دیں، بہت ہوا تو سر ہلا دیا۔ وہ ان کے چرن چھونے جھکتا تو اتنی تیزی سے ہٹتے کہ وہ گرتے گرتے بچتا اور کھسیانا سا ہو کر ہمارے پاس آجاتا اور کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا۔

''ماما تو مجھے دیکھ کر یوں بھاگتے ہیں جیسے......''۔

''تم غلط سلط کام جو کرتے رہتے ہو......''۔

میں نے ایک دن کہہ ہی دیا۔ اس نے فخر سے اپنا سینہ پھلا کر جواب دیا۔

''یہ ویروں کا کام ہے ویروں کا...... جانتی ہو بڑے بڑے لوگ مجھے دیکھ کر راستہ چھوڑ دیتے ہیں، اچھے اچھے مجھے نمسکار کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں......''۔

''ڈر سے نا......؟''

میں نے فوراً اسے ٹوکا۔

''ہاں تو اور کیا......؟ دنیا میں سارے کام ایک دوسرے کے ڈر ہی سے تو کئے جاتے ہیں ورنہ کسی کو کیا پڑی ہے کہ کسی کو نمسکار کرتا پھرے......''۔

اس نے باتوں کو دوسرا رُخ دینے کی کوشش۔

''اور پولس......؟''

میں نے پولس کا نام لے کر اس کا مذاق اڑایا۔ وہ بڑے تمسخر سے ہنسا۔

''پولس......؟ اس کے تو بڑے صاحب لوگ خود ہی مجھے سلام کرتے ہیں۔ انہیں تو میں تنخواہیں بانٹتا ہوں......''۔

''آپ سرکار ہیں کیا......؟''

میں نے بھی اسی کے انداز میں دریافت کیا۔

''بے شک......! آپ کیا سمجھتی ہیں کہ وہ صرف ایک ہی سرکار سے تنخواہ لیتے ہیں......؟ جی نہیں حضور، ان کے لئے تو کتنی سرکاروں نے Pay-roll کھول رکھے ہیں......''۔

اس نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا۔ اس کی بات پوری طرح میری سمجھ میں آئی تو نہیں لیکن میں دل ہی دل میں مرعوب بہت ہوئی۔ بھلا جو آدمی پولس تک کو تنخواہیں دیتا ہے وہ چھوٹا کیسے ہوسکتا ہے، بابو جی تو بس یونہی......

آنکھیں کھول کر وہ چپ چاپ ہمیں اور گھر کی بوسیدہ در و دیوار کو گھورتے رہے، پھر مجھے انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا، میں بہنوں میں بڑی تھی، میرا دل ایک لمحہ میں پتہ نہیں کتنی بار دھڑکا، ایک آدھ بار ڈوبتے ڈوبتے بھی بچا، میں ڈرتے ڈرتے ان کے قریب گئی۔

''راجو کب سے نہیں آیا ہے......؟''

انہوں نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ یہ لمحہ مجھ پر بہت کڑا تھا۔ کیوں کہ اس قسم کے سوال کا جواب ہم بہت سوچ سمجھ کر دیتے تھے اور اس سے پہلے آپس میں رائے ضرور ملا لیتے، بابو جی

کے سامنے تو آنکھوں سے بھی کام لینے کا سوال نہیں تھا، میں نے ایک گول مول سا جواب دیا۔

''جی، بہت دنوں سے نہیں آیا......''۔

''کیوں......؟''

ان کا لہجہ بہت شانت تھا، لیکن ان کے سوال ہمیں بہت تیکھے لگ رہے تھے۔

''ہمیں کیا پتہ......؟ شاید پولس پکڑ کر لے گئی ہو......''۔

اس وقت ماں میری مدد کو آگئیں۔ پولس کا نام سن کر بابو جی نہ صرف شانت رہے بلکہ ان کے چہرے پر ایک گونہ طمانیت بھی جھلکی جسے صرف ہم ہی محسوس کر سکتے تھے۔

''کیوں......؟ کوئی خاص بات ہے کیا......؟''

اس دفعہ ماں نے پوچھا۔ وہ کچھ نہیں بولے اور چپ چاپ اٹھ گئے۔ ہم نے چین کی سانس لی۔

''ضرور راجو نے کوئی بڑی حرکت کی ہے، بابو جی اس لئے اتنے پریشان ہیں......''۔

میں نے ماں اور بہنوں کے درمیان سرگوشی کی، سب کے چہرے پر میری بات کی تائید لکھی تھی۔ واقعی راجو کا وجود اور ہمارے ہاں اس کی آمد و رفت ہماری پرسکون زندگی پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ آج تو بابو جی نے پتہ نہیں کیا سوچ کر اس کے سلسلے میں ایک نرم رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ ممکن ہے یہ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہو۔ اس وقت تو وہ بڑی خاموشی کے ساتھ باتھ روم چلے گئے تھے لیکن وہاں سے واپسی کے بعد ان کا کیا رویہ ہوگا، ہم کچھ نہ جانتے ہوئے بھی دہل رہے تھے۔

راجو کے جانے کے بعد یا اس کی آمد کا سن کر وہ جب ہماری کلاس لیتے تو ہمیں سخت کوفت ہوتی۔ ہم لڑکیوں کو اس پوری مدت کے ایک ایک لمحے کا حساب دینا پڑتا جب تک وہ رہتا۔

کون اس سے کیا کیا باتیں کر رہا تھا......

کس نے کتنی بار اس کے ہاتھ یا پیٹھ وغیرہ کو چھوا......

کون کتنی بار اس کے پاس بیٹھا اور کتنے فاصلے پر......

وہ ہنسی مذاق تو نہیں کر رہا تھا......؟

وغیرہ وغیرہ......

ہم ان کی زبردست تفتیش کا ایمان داری سے جواب تو دے دیتے لیکن اندر اندر ہمیں سخت ندامت ہوتی اور ان پر غصہ بھی آتا کہ وہ کیا سمجھ کر اس قسم کے سوالات کرتے ہیں، کہیں انہیں ہمارے کیریکٹر پر تو شک نہیں......؟ اگر ایسا ہے تو...... ہیں، یہ تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا، لیکن راجو کم بخت بھی ایک ہی ڈھیٹ تھا، انکا بھٹکتا کہیں سے آ ہی جاتا، پتہ نہیں اس میں یہ سمجھ کیوں نہیں تھی کہ بابو جی کو اس کا آنا بالکل پسند نہیں، حالانکہ ہم نے اس کے ساتھ سرد مہری کا سلوک کرنا شروع کر دیا تھا۔ حتی الامکان اس سے دور ہی دور رہتے، اس سے چائے پانی کو بھی نہ پوچھتے۔ وہ کوئی سوال اُچھالتا تو سنی ان سنی کرنے کی کوشش کرتے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم دل سے چاہتے تھے کہ وہ اب نہ آئے۔

رفتہ رفتہ بڑے جرائم میں بھی اس کا نام آنے لگا تھا۔ ڈکیتی ہو، بینک روبری ہو، اغوا کا کوئی بڑا کانڈ ہو، اس کا یا اس کے گرگوں کا نام آ ہی جاتا۔ کئی بار وہ گرفتار بھی ہوا اور معجزاتی طور پر باہر بھی نکل آیا۔ ایک بار ماں نے اس سے پوچھا بھی کہ وہ اتنی آسانی سے نکل کیسے آتا ہے، اس نے بڑے فخر سے جواب دیا۔

''مجھے روکنے کے لئے ثبوت چاہئے نا، وہ انہیں کہاں ملے گا، ہمت کس کی ہے میرے خلاف گواہی دینے کی......''۔

وہ بہت ڈھٹائی سے جرائم کی ان سرگرمیوں میں بھی اپنا نام جوڑ دیتا جن سے براہ راست اس کا واسطہ نہیں بھی ہوتا تھا۔

بابو جی کافی دیر کے بعد باتھ روم سے نکلے تو قدرے پرسکون دکھائی دے رہے تھے۔ وہ پھر اپنی مخصوص آرام کرسی پر آ بیٹھے۔ ماں ان کے لئے فوراً چائے لے آئیں۔ اس دفعہ چائے کی پیالی رکھی رکھی ٹھنڈی نہیں ہوئی، چائے کی چسکیوں کے درمیان وہ ماں سے مخاطب ہوئے۔

''آپ کو پتہ ہے شہر کی کیا حالت ہو رہی ہے......؟''

''مجھے کیا پتہ، میں تو گھر کے اندر رہتی ہوں......''۔

ماں نے ایک بے ضرر سا جواب دیا۔

''ہاں تو آپ جان لیجئے، اب شریفوں کا اپنی گلی اور محلے میں چلنا مشکل ہو رہا ہے، اب لوگ دس پانچ جیب میں رکھ کر نکلتے ہیں تاکہ کچھ نہ نکلنے پر کم سے کم جان تو بچ جائے، اگر راہ چلتے

کسی کو فوراً راستہ نہ دیا تو جان بھی جا سکتی ہے۔ لپڑ تھپڑ کر دینا تو بہت عام ہو گیا ہے......"۔

ان کی آواز اونچی نہیں تھی لیکن اس چھوٹے سے گھر میں خصوصاً اس وقت بہت اونچی لگ رہی تھی، ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ راجو ہی کے بارے میں کوئی بڑی بات کہنے کے لئے تمہید باندھ رہے ہیں، ہم وہی بات سننے کو بے چینی سے منتظر تھے۔

ماں بہت حیرت سے ان کی باتیں سن رہی تھیں، اس عالم میں وہ بولیں۔

"یہ تو کلجگ ہے کلجگ...... شریفوں کا چلنا پھرنا دوبھر ہو جائے تو اور کیا کہیں گے، لیکن یہ بتائیے، ایسے میں کیا کرنا چاہئے......"۔

"رام نام کا جپ کرتے ہوئے جائے اور کام کر کے اسی طرح فوراً لوٹ آئے......"۔

بابو جی نے بے خیالی کے انداز میں جواب دیا۔

"کیا اس طرح جان بچ جائے گی......؟"

ماں نے بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا، بابو جی کو جیسے ہوش آ گیا، وہ جواب میں کچھ نہ بولے اور جلدی جلدی اپنی چائے ختم کرنے لگے، خالی پیالی کو سرکا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولے۔

"راجو آئے تو اس سے کہنا مجھ سے ملے بغیر نہیں جائے گا۔ اس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں"۔

وہ کمرے میں چلے گئے تو ہم نے ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ان کی یہ بات ہمارے پلے نہیں پڑی تھی۔

✠ • ✠ • ✠

وسیلہ

خبر آئی اور اسے فوراً محسوس ہوا کہ اچانک اس کی زندگی سے کوئی چیز روٹھ کر چلی گئی۔ سامنے پڑا ہوا دبیز پردہ اٹھ گیا اور بہت سی ایسی چیزیں بے پردہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئیں جنہیں وہ پہچانتا ہی نہیں۔ وہ ان کے درمیان بالکل تنہا، اجنبی، انجان سا کھڑا رہ گیا۔

اس نے جلدی جلدی اپنی آنکھیں ملیں اور اپنے آپ کو، اپنے اطراف کو جاننے کی کوشش کی۔ اس عمل سے اس کے احساس کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔

اس نے جدھر نگاہیں اٹھائیں، ایک زبردست کمی کا احساس ہوا۔ ایک عجیب قسم کا سوناپن اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کی آنکھوں اور احساس میں داخل ہو گیا تھا۔

خبر آنے سے پہلے وہ اپنے کمرے میں دیر سے تنہا تھا اور اس تنہائی کو گلے لگا کر اپنے سارے کام انجام دے رہا تھا۔ خوش تھا، مگن تھا، روز ہی ایسا ہوتا تھا، اس کے ہاں کوئی آتا جاتا نہیں تھا، وہ چاہتا بھی کب تھا کہ اس کے ہاں کوئی آئے۔ لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی تھا جو ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر گیا ہے۔ یہ کمی آناً فاناً سر چڑھ کے بولنے لگی تھی۔ وہ یونہی بے ارادہ دوسرے کمرے میں گیا، کمی اس کے ساتھ ساتھ وہاں بھی گئی، وہ بالکونی میں آیا، وہاں بھی کسی ایسے وجود کی گرمی موجود تھی جو ابھی ابھی اٹھ کر وہاں سے گئی ہو۔

نیچے انجانی باراتوں کا قافلہ تھا جس میں رنگ و آہنگ، چیخ و پکار اور جوش و خروش ناچ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تک بلا مقصد اس سیلِ رواں کو دیکھتا رہا۔ سب کچھ تھا لیکن بھیڑ میں تنہائی کیا چیز ہوتی ہے، اس کی واقفیت اسے آج ہی ہو رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دور دور تک کچھ تلاش کرتی رہیں لیکن اس تلاش نے اس کے اندر کی ویرانی کو اور ہوا دی۔ وہ ناکام سا اپنے بستر پر آگرا اور

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ بہت دنوں سے یہاں رہتا تھا...... تنہا تنہا...... لیکن یہ تنہائی دوسروں کی نگاہوں میں بستی تھی، اس کا اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ دن بھر اپنے دھندے میں مصروف رہتا، جو کچھ حاصل کرتا، اسے اپنے کھانے پینے اور تفریح میں بے دریغ خرچ کر ڈالتا۔ جب محنت اور تفریح سے تھک جاتا تو اپنے بستر پر آ کے گر جاتا، یہ سچ ہے کہ وہ اس کو مکان نہیں، رات گزارنے کا ایک ٹھکانا ہی سمجھتا تھا۔ آسائش و آرائش کی ساری چیزیں موجود تھیں، یہ چیزیں اسے آرام وسکون فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ وہ تنہائی بھی دور کرتیں جو دیکھنے والوں کی آنکھوں میں مسلسل گڑتی تھیں۔

کبھی کبھار دو چار روز کے لئے وہ اپنے گاؤں بھی جاتا جہاں اس کا بھرا پرا گھر تھا۔ ماں، باپ، بھائی، بہن، رشتہ دار، نوکر چاکر، وسیع آنگن، تاروں بھرا آسمان، دور دور تک پھیلی ہوئی پھولوں سے لدی دیواریں اور رات میں صرف سو پڑنے کا بستر نہیں بلکہ دن میں آرام کرنے کا دیوان بھی۔ لیکن اس بھری پری دنیا میں وہ اپنے آپ کو اکھڑا اکھڑا سا محسوس کرتا، جب تک وہاں رہتا، اپنے آپ کو قیدی سمجھتا۔ چھٹی ختم ہوتے ہی رسی تڑا کے بھاگ نکلتا۔ ماں باپ اس کی حالت پر افسوس کرتے لیکن وہ اپنے معاشرے کا وہ تنہا آدمی تھا جو رشتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا، ماں باپ سے بھی اس کا واسطہ رسمی سا رہ گیا تھا۔ اس نے جو راہ اختیار کی تھی اس میں وہ مگن تھا۔ اس سے الگ کسی راستے کا تصور اسے پریشان کر ڈالتا۔ سیدھی راہ کی وہ چیزیں اسے دکھائی نہیں دیتیں جو دوسروں کو نظر آ جاتیں۔ کامیابی کے وہ تمام راستے اسے مسدود نظر آتے جو دوسرے اسے دکھاتے۔ وہ بس وہی دیکھتا جو اس کی نگاہیں اسے دکھاتیں۔

تنہائی دور کرنے کے جو مشورے اسے دیئے جاتے انہیں وہ اپنے پاؤں کی زنجیر سمجھتا تھا۔

اسے اپنی آزادی بے حد عزیز تھی اور اس کی حفاظت کے لئے وہ ہر قربانی دینے کو تیار تھا۔

لیکن خبر کے آنے کے بعد اچانک وہ نامعلوم تنہائیوں سے گھر گیا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں وہ چیز ڈھونڈ رہا تھا جو وہاں کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ اسے اس شے کی کمی کا احساس ہو رہا تھا جس سے اس کے کمروں اور بالکونی کا کبھی واسطہ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اس پردے میں ابھی تک چھپا ہوا تھا جسے اس نے کبھی محسوس ہی نہیں کیا تھا اور جس میں چھپ کر اس نے اپنی تنہائی کا لطف اٹھایا تھا، اب وہی تنہائی نڈر ہو کے نہایت بے خوفی سے اسے ڈس رہی تھی۔

تنہائی کے زہر اور کسی نامعلوم چیز کی کمی نے جلد ہی اسے بے حال کر دیا اور چند ہی لمحوں میں وہ اپنے معاشرے کا سو فیصد تنہا آدمی بن گیا۔ اس کی بنائی ہوئی ساری ترتیب اور اس کی آنکھوں سے دیکھتا سارا راستہ گڈمڈ ہو کے رہ گیا۔ وہ ڈال سے ٹوٹے پتے کی طرح ڈولنے لگا جسے ایک تیز ہوا کہیں بھی اڑا کے لے جا سکتی تھی۔

ایک عالم بے خودی میں وہ اپنے گاؤں جا پہنچا۔ اس کی آمد بالکل ویسی ہی تھی جیسی اس کے باپ کی ہوا کرتی تھی لیکن یہ چیز صرف وہی محسوس کر سکا، اس کی بوڑھی ماں اسے دیکھتے ہی رو پڑیں۔

''اب آئے ہو...... ان کی آنکھوں میں صرف تم تھے، جس دم دم نکلا، ان کی نگاہیں دروازے پر لگی تھیں......''۔

اس نے پتہ نہیں کس جذبے کے تحت ماں کو سینے سے لگا لیا۔

''جو ہونا تھا، وہ تو ہو گیا...... اب میں آ گیا ہوں......''۔

اس کے باپ کا بستر جوں کا توں لگا تھا۔ پلنگ پر مچھر دانی لگی تھی، سرہانے ہاتھ کا پنکھا دھرا تھا جس سے اس تاریخ کا اخبار دبا ہوا تھا۔ ان کے دونوں تکیئے اوپر تلے رکھے تھے، اوپری تکیئے میں ایک خفیف سا گڈھا تھا جیسے ابھی کوئی لیٹا لیٹا اٹھ کر گیا ہو، پائینتی ادھ کھلی چادر پڑی تھی۔

وہ پھپھک پھپھک کے رونے لگا۔ شاید اس طرح روتے اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ سب کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ کچھ دبی دبی سسکیاں...... اسے کسی نے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ اس کا رونا برحق تھا۔ اب بھی نہ روتا تو کب روتا۔

تھے تو وہ ایک فرد واحد، لیکن پتہ نہیں ان کی شخصیت میں ایسی کون سی بات تھی کہ ان کی موجودگی میں کسی کو بھی کوئی فکر نہ ہوتی۔ لاشعوری طور پر ان کی شخصیت میں چھپ کر وہ سب کچھ حاصل کر لیتے تھے۔ اسے قدم قدم پر یہ احساس ہوتا رہا کہ وہ ہیں، آس پاس کہیں موجود ہیں، ابھی ابھی قنوج کے اس عطر کی خوشبو آئے گی جو ان کا خاص عطر فروش انہیں دیتا تھا۔ پھر ان کے پکارنے کی آواز آئے گی۔ اس کے لئے کوئی مخصوص نام طے نہیں، جو سامنے آیا، اسے ہی پکار لیں گے یا پھر جس کا نام ذہن میں آ جائے۔

شہر جانے کے تصور سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔ وہ اپنے فلیٹ میں کیسے جا سکے گا۔ کیسے وہاں رہ سکے گا۔ وہاں تو تنہائی کنڈلی مار کے بیٹھی ہے اور اس کے انتظار میں بے تاب ہو رہی ہے۔

وہ گیا اور اس نے ڈسا۔ بلکہ ڈس ڈس کے وہ اسے مار ہی ڈالے گی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جہاں سے وہ گئے ہیں، جہاں وہ رہتے تھے، وہاں ان کی عدم موجودگی کا دور دور تک پتہ نہیں لیکن جہاں وہ کبھی نہیں گئے، وہاں ذرّے ذرّے پر ان کی عدم موجودگی قبضہ کئے بیٹھی ہے۔ اس کش مکش میں اس کا جانا ٹلتا رہا۔ مزید تاخیر اسے مشکلات میں مبتلا کر سکتی تھی۔ جس راستے پر وہ چلتا رہا تھا اس پر اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ وہاں سے واپسی یا کہیں پر رکنا اس کے لئے ممکن ہی نہیں تھا۔

اس کے جسم اور اس کے احساسات کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو اس کی واپسی کے حق میں ہو لیکن کبھی کبھی فیصلے بھاری دل سے بھی کئے جاتے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ پر لاد لئے جاتے ہیں۔

اچانک اس کی نگاہیں کونے میں بالکل غیر اہم انداز میں کھڑی چھڑی پر پڑ گئی۔ اس کے باپ کی چھڑی......

اسے محسوس ہوا کہ چھڑی دھیرے دھیرے ہل رہی ہے، اس کے کھٹ کھٹ کی آواز سارے گھر میں گونج رہی ہے۔

یہ چھڑی ان کی شخصیت کا ایک اٹوٹ حصہ تھی۔ اس کے سبب دُور ہی سے ان کی آمد یا موجودگی کی اطلاع مل جاتی۔ وہ نظر آتے تو چھڑی بھی نظر آتی، چھڑی دکھائی دیتی تو وہ بھی دکھائی دیتے۔

اسے محسوس ہوا کہ ابھی وہ کسی ایک طرف سے آئیں گے، چھڑی ہاتھ میں لیں گے اور ٹہلتے ہوئے باہر نکل جائیں گے۔

وہ دیر تک چھڑی پر اپنی نگاہیں ٹکائے رہا۔

کوئی نہیں آیا......

بہت دیر تک کوئی نہیں آیا......

وہ بالکل غیر ارادی طور پر، آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور دھیرے سے چھڑی کے مٹھ کو اپنی مٹھی میں کس لیا۔

پل بھر میں اسے محسوس ہوا کہ اس کی تنہائی گھبرا کے اسے چھوڑ کر دور جا کھڑی ہوئی اور خوف زدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔

اس نے چھڑی پر اپنی گرفت اور مضبوط کر لی۔

✠ • ✠ • ✠

مضبوط کھونٹا

جہاز سے اترتے وقت مجھے یہ اندازہ بالکل نہیں تھا کہ جنید ماموں نے بھی میرے استقبال کے لئے یہاں آنے کی زحمت کی ہوگی۔ میں لابی میں پہنچا تو ان کا لہراتا ہوا رنگین رومال میری آنکھوں کے سامنے چمک سا گیا۔ وہ میرے چچازاد بھائی کے ساتھ بالکونی میں کھڑے تھے۔ کھڑے کیا تھے مارے خوشی کے ناچ رہے تھے۔ ان کی محبت پر میری آنکھوں سے وہ چشمہ پھوٹ پڑا جو برسوں پہلے خشک ہو چکا تھا۔

انہوں نے نہایت گرم جوشی سے مجھے گلے لگایا اور دیر تک لگائے رہے۔ میرے چچازاد بھائی کی تو ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی کہ وہ مجھ سے سٹ بھی سکے، وہ تو جب جنید ماموں مجھ سے الگ ہوئے اور ان کے تابڑ توڑ سوالوں سے میں نجات پا سکا تو اس پر میری باقاعدہ نگاہ پڑی۔

جنید ماموں کا اصرار تھا کہ میں ان کے ہاں قیام کروں، بڑے ابا سے ملنے ضرور جاؤں، پر ان کے ہاں ٹھہرنے میں مجھے تکلیف ہوگی، لیکن میں ان کی بات کیسے مان سکتا تھا، اتنے دور دراز کا سفر میں نے صرف بڑے ابا سے ملنے ہی کے لئے تو کیا تھا، میرے ذہن میں تو دور دور تک جنید ماموں کی شبیہ بھی نہیں تھی، ان کے خواہ مخواہ اصرار پر مجھے تعجب سا ہوا۔ بہرکیف زحمت برداشت کر کے وہ اتنی دور میرے استقبال کے لئے آ گئے تھے۔ میں نے نہایت خوبصورتی اور لجاجت سے انکار کر دیا، انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ ان کے ساتھ دوسری صبح ناشتہ کروں، پھر آگے کا پروگرام دیکھا جائے گا۔

بڑے ابا اس لائق نہیں تھے کہ وہ گرم جوشی سے میری طرف لپک بھی سکیں بلکہ وہ آسانی سے کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے، میں نے اپنا سر ان کی گود میں ڈال دیا۔ ان کے کپکپاتے ہوئے

ہاتھ میرا سر ٹٹولتے رہے اور آنکھوں میں امڈ آیا گرم پانی میری پیشانی پر ٹپک گیا۔ ان آنسوؤں میں گرمی کے علاوہ بھی بہت کچھ باقی تھا۔

کافی دیر کے بعد میں نے سر اٹھایا اور ان کے شفقت بھرے سوالوں کے جواب دے سکا تو اردگرد پر میری نگاہیں پڑیں۔ بوسیدگی اور بدحالی کونے کونے سے پکار رہی تھی۔ یوں کہیں کہیں ماضی کی عظمت کی جھلکیاں بھی دکھائی دے جاتی تھیں لیکن اس کے لئے دیدہ بینا کی ضرورت تھی جو اتفاق سے کسی حد تک اس وقت میری گرفت میں تھی۔

حویلی کا زیادہ تر حصّہ گر چکا تھا، جو باقی تھا، وہ بھی گرنے ہی والا تھا، بس ایک بڑا ہال اور اس سے ملحق ایک کمرہ بچ رہا تھا، یہی کمرہ غالباً بڑے ابّا اور بڑی اماں کا رہائشی کمرہ تھا۔ ہال میں وہ اپنے روزمرہ کے اوقات گزارتے، کھانا کھاتے، نماز پڑھتے اور لوگوں سے ملتے جلتے تھے۔ اس کے ایک بڑے زمینی حصّے میں ایک بوسیدہ ایرانی قالین بچھا تھا جس کے نقش ونگار اب بالکل اڑ چکے تھے اور قالین کی اپنی کھردری زمین اپنی تمام تر بدہیئتوں کے ساتھ نمایاں ہوگئی تھی۔ ہال میں دو جگہ فانوس بھی ٹنگے تھے جس کے زیادہ تر شیشے ٹوٹ چکے تھے، جو باقی بچے تھے، وہ گرد وغبار اور دھول دھویں سے اٹے ہوئے تھے۔ اس قسم کے فانوس میں نے بلجیم کے میوزیم میں دیکھے تھے۔ باہر ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں کے پاس دو بڑے بدھنے رکھے تھے جن کے نقش ونگار پر میل کی دبیز تہیں جم گئی تھیں۔ یہ چیزیں اپنا آب کھو چکی تھیں لیکن ان سے بڑے ابّا کی ماضی کا خاموش تعارف ہو جاتا تھا۔ ماضی جو حال کا ایک اٹوٹ حصّہ اور حال ہی کا ایک مضبوط سلسلہ ہوتا ہے۔ بڑے ابّا نے اپنے کمرے میں میرے قیام کا انتظام کیا تھا اور اپنا بستر ہال کے کنارے لگوالیا تھا۔ میں نے اس تواضع کو قبول کرنے سے سختی کے ساتھ انکار کر دیا، وہ مجھے قائل کرنے کو طرح طرح کی تاویلیں دیتے رہے، یہاں تک کہ میں نے اپنا بستر ہال میں خود ہی لگالیا۔

اتنی دیر میں مجھے جنید ماموں کا خیال ہی نہیں آیا۔ بڑے ابّا اور بڑی اماں سے دل کھول کر مل لینے اور جی بھر کے باتیں کر لینے کے بعد اچانک وہ مجھے یاد آئے۔ میں نے انہیں اطلاع دی کہ صبح کے ناشتے پر جنید ماموں نے مجھے مدعو کر رکھا ہے۔

''جنید میاں......؟ وہ تمہیں کہاں مل گئے......؟''

بڑے ابّا نے مجھے غور سے دیکھا، میرے چہرے پر کسی تحریر کی تلاش بے سود تھی، میں نے

سادگی سے جواب دیا۔

''وہ بچارے مجھے رسیو کرنے ایئرپورٹ پہنچ گئے تھے......۔''

''اچھا......۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائے۔ شاید میرے چچازاد بھائی نثار نے اس سلسلے میں انہیں کچھ بتایا نہیں تھا۔ میں نے پھر کہا۔

''اس قدر محبت سے ملے جنید ماموں کہ طبیعت خوش ہوگئی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ایسی شخصیت آپ لوگوں کے آس پاس، بلکہ گھر میں موجود ہے......۔''

بڑے ابا خاموش رہے۔ مسکراہٹ البتہ ان کے ہونٹوں سے چپکی رہی جس کی معنی خیزی میں کچھ اضافہ ہوگیا تھا۔

جنید ماموں کا مکان دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس چھوٹے سے شہر میں اس کی حیثیت ایک محل سے کم نہیں تھی۔ جنید ماموں نے اس کی سجاوٹ، بناوٹ، پالش وغیرہ پر بہت محنت کی تھی۔ ہر کمرے کا الگ رنگ و روغن اور علیحدہ فرنیچر، دروازوں پر اسی رنگ کے پردے، میری نگاہوں میں حیرت نے ابھی جنم ہی لیا تھا کہ جنید ماموں بولے۔

''سری نگر کے اوبرائے پیلس میں ہر کمرے کو اسی ڈھنگ سے سجایا گیا ہے اور ان کمروں کے نام بھی اسی مناسبت سے رکھے ہیں......''۔

میں سری نگر نہیں گیا تھا لیکن اوبرائے پیلس کا نام ضرور سن رکھا تھا، پہلے راجہ کا محل تھا...... میں تھوڑا مرعوب ہوا۔

جنید ماموں غایت دلچسپی سے اپنے گھر کی ایک ایک چیز بھی دکھاتے رہے۔ واقعی انہوں نے چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی نہایت محنت اور جاں فشانی سے حاصل کی تھی۔ کسی رئیس کے ہاں اونے پونے کوئی چیز بک رہی ہوتی، انہوں نے خرید لی۔ کسی ضرورت مند کو اشد ضرورت نے آ گھیرا، انہوں نے فوراً مدد کردی، بدلے میں کوئی گوہر نایاب حاصل کرلیا، کسی کباڑے کے ہاں کوئی نادر چیز دکھائی دے گئی، انہوں نے منہ مانگے داموں خرید لیا، کوئی دوست کہیں باہر جانے لگا، انہوں نے کسی خاص چیز کی فرمائش کردی۔ کچھ معمولی چیزوں پر پالش کرکے انہوں نے اس پر دور دراز کا ایسا ٹھپہ لگا دیا کہ یقین نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اصل میں روزگار بھی

انہوں نے ایسا ڈھونڈ نکالا تھا جو ان کے اس شوق میں مہمیز ہی لگاتا تھا۔ کام تو وہ بہت سے کرتے تھے اور ہر کام میں انہیں کامیابی ہی ملتی تھی۔ لیکن اصل کام ان کا یہ تھا کہ وہ پرانے لٹے پٹے رئیسوں کے کھیت، باغات، مکانات اور دوسرے سامان اونے پونے خرید لیتے اور شوقین مزاج خریداروں کے ہاتھ منہ مانگے داموں پر بیچ ڈالتے، اپنے کام کی چیز ان کے دیدہ بینا کے سامنے آ جاتی تو وہ اسے الگ کر لیتے۔ ان کے مکان کے دروازوں اور الماریوں کے اکثر قبضے نایاب اور آثار قدیمہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس قسم کی چیزوں کی بھرمار نے ان کے گھر کی دلچسپی بڑھا دی تھی۔ پیسے آ جانے پر انہیں اکثر و بیشتر دعوتیں دینے کا شوق بھی ابھر آیا تھا۔ ان کے مہمانوں میں خاص طور پر ضلع کے حاکم، سیاستداں اور نو دولتیے ہوا کرتے۔ ان پرانے رئیسوں کو بھی وہ بڑے اہتمام کے ساتھ مدعو کرتے جن کے نام کی چمک دمک کسی نہ کسی وجہ سے ابھی ماند نہیں پڑی تھی۔ مدعوئین کا زیادہ وقت ان کے عجائبات کو دیکھنے اور مرعوب ہونے میں صرف ہوتا۔

ڈائننگ ٹیبل، چمکیلے شیشوں سے مزین، گھومنے والے تو بہت ہوتے ہیں لیکن جنید ماموں کے ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کی جو انوکھی اور انواع و اقسام کی چیزیں موجود تھیں وہ آج کے مشینی دور میں ذرا کم ہی نظر آتی ہیں، دراصل اتنی چیزوں کو اطمینان سے کھانے کی فرصت کسے ہے؟

''ماموں، یہ آپ ناشتہ کھلا رہے ہیں یا کھانا؟ بلکہ یہ تو کئی وقت کا کھانا ہے......''

میں نے ڈائننگ ٹیبل پر نظر ڈال کر کہا۔ ماموں کا چہرہ چمک اٹھا، میں نے انجانے میں جو تیر چلایا تھا وہ شاید صحیح نشانے پر جا بیٹھا تھا۔

''ارے، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے بھانجے...... ناشتے میں اور ہو بھی کیا سکتا ہے، بس یوں سمجھو کہ تمہاری خاطر کی شروعات ہوئی ہے......''۔

ان کا لہجہ خاصا سرشار تھا۔

''اب ہم لوگ اتنا کہاں کھا سکتے ہیں ماموں......''۔

میں نے انکساری سے جواب دیا۔ اس دفعہ ممانی بولیں۔

''بھیا، ٹیبل پر سب چیزیں کھانے کے لئے تھوڑی ہوتی ہیں، مہمان کو جو پسند آ جائے......''

''میں کوئی مہمان تھوڑی ہوں......''۔

میں نے فوراً جواب دیا۔

''تم تو مہمانوں سے بڑھ کر مہمان ہو بھائی، ہزاروں میل دور رہتے ہو، کتنے دنوں کے بعد آئے ہو، کچھ یاد ہے تمہیں......؟''

جنید ماموں بچھے جا رہے تھے۔ باتوں کو زیادہ طول دینا مناسب نہیں جان کر میں نے کھانے کی چیزوں کو چکھنا شروع کر دیا۔ اتنی چیزیں تھیں کہ اگر صرف ان کے نام ہی لے لئے جاتے تو اچھا خاصہ وقت گزر جاتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بہت سی چیزوں کے نام تو میں جانتا بھی نہیں تھا۔ بہت سی چیزوں کے مزے بھول چکا تھا کیوں کہ انہیں پکانے، بنانے میں اتنی محنت اور وقت درکار ہوا کرتے کہ وہ چیزیں از خود متروک قرار پا چکی تھیں۔ لیکن زبان کی خفیہ اور پر اسرار تہوں پر مزے کی ایسی لیک ہوتی ہے کہ برسوں بھولا ہوا ذائقہ بھی فوراً تازہ ہو جاتا ہے۔ مچھلی کے کیٹلیٹ بہت بنتے ہیں، ان کے قتلوں پر کچھ مسالے اور بیسن وغیرہ لپیٹ دیئے جاتے ہیں اور انہیں کیٹلیٹ کا نام دے دیا جاتا ہے۔ میں نے اپنے گھر میں جو کیٹلیٹ کھائے تھے، ان کا مزا بھی نہیں بھولا تھا، بڑے ابا کے ہاں فرمائش کر نہیں سکتا تھا، جنید ماموں کے ہاں تقریباً وہی ذائقے والے کیٹلیٹ مل گئے تو میں نے بھی جی بھر کے ان سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کی۔ جنید ماموں کے ہاں میں نے اپنی پسند کے دوسرے بہت سے پکوان چکھے اور مزا آ گیا۔

ناشتے سے فراغت کے بعد جنید ماموں نے اپنے نوادرات کا ذکر چھیڑا۔ حالانکہ میرے پاس وقت کم تھا اور میں زیادہ سے زیادہ وقت بڑے ابا کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا کہ پتہ نہیں پھر ان سے کب ملاقات ہو، ملاقات ہو نہ ہو، لیکن جنید ماموں کے نادر پکوان پیٹ میں جا کر اپنی وفاداری دکھانے میں مصروف ہو گئے تھے اور زبان و ذہن کی لگام ان کے ہاتھوں میں تھی۔

جنید ماموں کے ذخیرے میں زیادہ تر مال پرانے اور کمیاب تھے۔ چاندی کے نادر ظروف، نقشیں پاندان، حقے، زر برق لبادے، چاندی کی تلوار اور نہایت خوبصورت نقش و نگار سے مزین نیام، تصویروں کے نہایت قیمتی فریم...... نئی چیزوں پر جنید ماموں نے شاید زیادہ دھیان نہیں دیا تھا، میں نے بھی نہیں دیا اور پرانے نوادرات کی چمک دمک میں کھویا رہا۔ اتنی دیر ہو گئی کہ کھانے کا وقت ہو گیا اور میں نے ہوش میں واپس آ کر جنید ماموں سے جانے کی اجازت مانگی، انہوں نے تعجب سے مجھے دیکھا، پھر گھورتے ہوئے پوچھا۔

''اور کھانا کون کھائے گا......؟''

”نہیں ماموں، میں بڑے ابا سے کہہ کر آیا تھا کہ کھانا انہیں کے ساتھ کھاؤں گا، وہ برا مان جائیں گے۔“

میں نے معذرت کی۔ وہ عجیب انداز میں ہنسے۔

”تم بھی بڑے بھولے ہو میرے بھانجے۔ ارے بھائی صاحب برا کیوں مانیں گے، تم کسی غیر کے ہاں تھوڑی آئے ہو، یہ بھی تو تمہارا ہی گھر ہے، سچ پوچھو تو وہ بہت خوش ہوں گے......“۔

تھوڑی دیر کے لئے میں پس و پیش میں پڑ گیا۔ پھر بھی میں نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

”یوں بھی ماموں، میں ان سے تھوڑی دیر کی اجازت لے کر آیا تھا اور پھر سچی بات یہ ہے کہ ناشتہ ہی میں نے اتنا کچھ کھا لیا ہے کہ اب مزید کھانے کی بالکل گنجائش نہیں، بڑے ابا کے ساتھ بھی میں رسماً ہی بیٹھوں گا......“۔

مگر جنید ماموں میری ایک سننے کو تیار نہیں تھے۔

”ارے بھائی، تمہاری ممانی نے تمہارے لئے اتنا اہتمام جو کیا ہے، اس کا کیا ہوگا، کھاؤ نہیں تو کم سے کم چکھ تو لو......“۔

لیکن جنید ماموں کی مدارت کے جس تار نے اندر اندر مجھے جکڑ لیا تھا وہ اس وقت اندر ہی اندر اچانک چھوٹ گیا، میں ایک جھٹکے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں ماموں، اس وقت میں معافی چاہتا ہوں، پھر کبھی آ کر کھا لوں گا، ابھی تو مجھے اجازت دے ہی دیجئے......“۔

جنید ماموں نے بادل ناخواستہ مجھے اس شرط پر جانے کی اجازت دی کہ میں پھر ان کے ہاں آؤں گا اور بہت جلد۔

میں تقریباً دوڑتا ہوا گھر کی طرف بھاگا جو بالکل قریب ہی تھا۔ میرا ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ محض لذت کام و دہن کے چکّر میں، میں نے اپنا وہ قیمتی وقت ضائع کر دیا جو بڑے ابا کے لئے بچا کر اتنی دور سے لایا تھا، جنید ماموں کا نام تو میرے ذہن میں تھا ہی نہیں۔

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

بڑے ابا میرا انتظار کرتے کرتے سو گئے تھے۔ ایک مجرمانہ احساس کے ساتھ میرا سر جھک گیا۔ اس وقت بڑی اماں نے مجھے سہارا دیا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا، تمہارے بڑے ابا کو تو ہر وقت نیند آتی رہتی ہے۔ اب اس وقت کوئی سونے کا وقت ہے بھلا۔ دن بھر میں پتہ نہیں کتنی بار ان کی آنکھیں بند ہوتی ہیں ''۔

ان کا لہجہ دھیما تھا مگر بڑے ابا کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

''آ گئے بیٹا، بہت دیر کر دی......؟''

''جی بڑے ابا، وہ جنید ماموں نے...... دراصل انہوں نے ''۔

میں نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش ہی کی تھی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور مسکرا کر بولے، ''جانتا ہوں بیٹا، جنید میاں نے تمہاری خاطر میں کتنا بڑا دستر خوان لگایا ہوگا اور ان کی باتیں...... ابھی تو انہوں نے ٹھیک سے تمہید بھی نہیں باندھی ہوگی......''۔

''جی ہاں، یہی بات ہے، بہت مشکل سے انہوں نے مجھے اجازت دی اور وہ بھی آپ کا نام لینے پر......''۔

میں نے اطمینان کی سانس لی کہ بڑے ابا نے اتنی دیر تک میری غیر حاضری کا برا نہیں مانا تھا بلکہ وہ کچھ لطف اندوز ہی ہو رہے تھے۔ انہوں نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

''کیا کیا نعمتیں تھیں بھائی، ان کے دستر خوان پر......؟''

میں گنانے ہی والا تھا کہ اچانک کسی نے میری زبان پکڑ لی...... نہیں...... بالکل نہیں...... بڑے ابا کو تفصیل بتانے کی بالکل ضرورت نہیں...... میں نے گول مول سا جواب دیا۔

''کوئی خاص نہیں، بس یہی روزمرہ کی چیزیں......''۔

''اب روزمرہ کی چیزیں تو نہیں کھلائی ہوں گی جنید میاں نے۔ آخر تمہیں اتنی محبت اور شدت سے بلایا تھا......''۔

بڑے ابا بھی کریدنے کے موڈ میں تھے۔ میں نے ان کے سامنے فوراً سپر ڈال دی۔

''مچھلی کے کٹلیٹ تھے بڑے ابا، بہت دنوں کے بعد کھائے، اور ایسی کوئی خاص چیز نہیں تھی، یوں ان کا دستر خوان بھرا ہوا تھا......''۔

''اور...... ان کے نوادرات......؟''

بڑے ابا کو بھی جنید ماموں کی ذرا ذرا خبر تھی۔

''جی ہاں...... انہوں نے تو اپنے گھر کو ایک میوزیم بنا رکھا ہے، ایسی ایسی چیزیں جمع کر

رکھی ہیں کہ میں تو دیکھ کر دنگ رہ گیا، اصل میں جنید ماموں کو دکھانے کا بھی بہت شوق ہے......"۔

بڑے ابا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اگرچہ کھانسی کے دورے نے ان کے قہقہے کو درمیان ہی میں اُچک لیا اور انہیں اس پر قابو پانے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑی اماں ان کی پیٹھ سہلاتی رہیں، میں نے بھی مستعدی سے ان کا ساتھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پرسکون ہوئے اور گہری گہری سانسیں لے کر انہوں نے پھر وہی سلسلہ جوڑا۔

"ہاں بیٹا، تمہارا آخری جملہ بہت صحیح ہے، دراصل انہیں دکھانے کا بہت شوق ہے اور اسی لئے انہوں نے اتنی چیزیں جمع کرنے میں اتنی محنت کی ہے، لیکن پتہ نہیں تمہارے سامنے انہوں نے ان نوادرات کا سلسلہ اپنے خاندان سے جوڑا یا نہیں......؟"

"میں سمجھا نہیں بڑے ابا......؟"

میں نے دھیرے سے دریافت کیا۔ وہ مسکرائے۔

"وہ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ فلاں چیز ان کے فلاں بزرگ استعمال کرتے تھے، فلاں چیز فلاں بزرگ کی ملکیت تھی، فلاں چیز......"۔

"تو کیا یہ بات صحیح نہیں ہوتی......؟"

میں نے درمیان میں سوال کیا، بڑے ابا پھر مسکرائے۔

"تو کیا تم واقعی نہیں جانتے اپنے جنید ماموں کی اصلیت......؟"

"جی...... میں سمجھا نہیں......"۔

میرے ذہن میں واقعی ان کی اصلیت وغیرہ کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔

بڑے ابا ابھی کچھ بولنے ہی والے تھے کہ بڑی اماں بول پڑیں۔

"اب چھوڑیئے بھی اس قسم کی باتوں کو۔ اصلیت بتا کر آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔ جو جیسا ہے اسے ویسا ہی رہنے دیجئے۔ دعا کیجئے کہ اللہ سب کے دن اسی طرح پھیر دے"۔

بڑے ابا ان کی بات پر کچھ دیر کے لئے چپ سے ہو گئے۔ میں ان کے کچھ بولنے کا منتظر رہا۔ وہ آہستہ سے بولے۔

"پھر بھی، اپنے گھر کے بچّوں کو تو معلوم ہونا چاہئے نا......"۔

"ضرورت کیا ہے۔ گھوم پھر کے وہ بھی تو آخر اسی خاندان کے آدمی ہیں نا، دنیا تو یہی

جانتی ہے اور جانتی رہے گی۔ آپ ان کی اصلیت وغیرہ بتا کر اپنا اور ان کا وقت ہی ضائع کیجئے گا۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے، میں دسترخوان بچھاتی ہوں"۔

بڑی اماں کا شعور سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ بڑے ابا جیسے جہاں دیدہ، تجربہ کار، بردبار اور باشعور شخص کو روشنی دکھانے کا مینار ہوں۔ ان کا ساتھ تقریباً پچاس برسوں کا تھا، اس طویل عرصے میں انہوں نے بڑے ابا کو کہاں کہاں روشنی دکھائی ہوگی، انہیں کس طرح جلتی بھٹیوں سے کندن بنا کر نکالا ہوگا...... میں پچاس برس قبل بڑے ابا کو دیکھ سکتا تو شاید کسی نتیجے پر پہنچ سکتا تھا۔

تخت پر بڑی اماں نے دسترخوان بچھا دیا اور باورچی خانے سے کھانے کے سامان اور برتن لانے لگیں تو مجھے اچھا نہیں لگا کہ ایک مہمان کی طرح بیٹھا ان سے اپنی خاطر کرواتا رہوں، میں نے ان کے ہاتھوں سے تمام چیزیں ان کے نا نا کرنے کے باوجود لے لیں اور انہیں زحمت نہیں ہونے دی۔ بڑی اماں نے بھی کھانے میں خاصا اہتمام کر ڈالا تھا۔ آلو کی ورقی بھجیا، تورئی کی سبزی میں اُبلے ہوئے انڈے، بخاری دال، کوفتے......۔

بڑے ابا بھی ہاتھ دھو کر تخت پر آ بیٹھے تو میں نے ان تمام چیزوں پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "بڑے ابا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مجھے مہمان کیوں سمجھا جا رہا ہے، ان تکلفات کی کیا ضرورت تھی، جو گھر میں بنتا، میں خوشی خوشی کھا لیتا......"۔

بڑے ابا نے غور سے مجھے دیکھا، شاید انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھی لی۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ یہ بات مجھے ہرگز نہیں کہنی چاہئے تھی۔ بڑے ابا بولے۔

"ایک زمانہ تھا کہ اس قسم کی چیزیں ہم کبھی کبھار منہ کا مزا بدلنے کے لئے کھاتے تھے، آج یہ وقت آیا کہ انہیں چیزوں سے اتنی دور سے آئے ہوئے بیٹے کی خاطر ہو رہی ہے، ویسے تمہارے لئے کوئی تکلف نہیں کیا گیا ہے بیٹا......"۔

"معاف کیجئے بڑے ابا، میں بے دھیانی میں بول گیا، ورنہ ان چیزوں کو کھانا تو دُور، انہیں دیکھے ہوئے بھی ایک عرصہ گزر گیا......"۔

میں نے کھانے میں غایت دلچسپی دکھانے کی کوشش کی، حالانکہ جنید ماموں کے ہاں جو کچھ کھایا تھا، وہ ابھی تک معدے میں موجود تھا اور وہاں گنجائش کی بڑی کمی تھی، پھر بھی بڑی اماں

کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں جو اپنائیت اور بھولی بسری خوشبوئیں موجود تھیں، ان کا تقاضا تھا کہ موقع نہیں ہوتے ہوئے بھی ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے، سو میں انصاف کرنے میں جی جان سے جٹ گیا۔

کھانے کے بعد میں بڑے ابا کے ساتھ ہی ان کے تخت پر لیٹ گیا۔ وہ اس وقت دنیا بھر کی باتیں کرنے کے موڈ میں تھے۔ وہ بتاتے گئے کہ اس خاندان پر یہ زوال کیسے آیا، اس کے پیچھے کیا کیا محرکات تھے۔ اس عمل میں اپنی کرنی کا کیا دخل رہا، کہاں کہاں پر کیا غلطیاں ہوئیں، دیوار پر لکھی تحریروں کو پڑھنے میں جان بوجھ کر کیسے کیسے چشم پوشی کی گئی وغیرہ وغیرہ۔

پورے قصے میں کوئی نئی، انوکھی یا چونکانے والی بات نہیں تھی، لاکھوں گھروں کی تقریباً ایک ہی داستان تھی۔ اس قوم کے پاس جب بھی اقتدار، دولت اور طاقت آئی، اسے عیش ہی کی سوجھی، طرح طرح کے کھانے ایجاد کرنے کا خیال آیا، سارا زور اس پر صرف ہوا کہ پیسے خرچ کس طرح کئے جائیں وغیرہ وغیرہ۔

مجھے اس قسم کی کہانیوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے اپنے کانوں سے ایسے بے شمار واقعات سنے تھے اور آنکھوں سے بہت کچھ پڑھا بھی تھا۔ میں بڑے ابا کی باتوں پر ہوں ہاں کرتا رہا۔ حالانکہ مجھے بہت زوروں کی نیند آ رہی تھی لیکن میں ان کی خاطر جبر کئے رہا۔ بڑے ابا اپنی بھڑاس نکال چکے تو بہت دیر سے ضبط کیا ہوا میرا سوال زبان پر پھسل گیا۔

"تو آخر، اب یہاں کیسے چل رہا ہے بڑے ابا......؟"

میں جانتا تھا کہ یہ سوال کوئی اور کرتا تو پتہ نہیں بڑے ابا کتنا برا مانتے، پر میں تو ان کے گھر کا بیٹا تھا، مجھے یہ جاننے کا حق تھا۔ بڑے ابا خاموش، کچھ سوچتے رہے اور جب تک وہ چپ رہے، میں نے اپنی سانسیں روکے رکھیں۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں واقعی وہ برا نہ مان گئے ہوں، خدانخواستہ ایسا ہوا تو میرا یہاں آنا اکارت ہی چلا جائے گا۔ میں محض ان کی خوشنودی ہی کے لئے تو یہاں آیا تھا۔ بڑے ابا کچھ توقف کے بعد گویا ہوئے۔

"کیا بتاؤں بیٹا، مستقل آمدنی کی کوئی صورت تو رہی نہیں، زمینداری کے باؤنڈ تو کب کے ختم ہو چکے، کھیت باغات بھی آہستہ آہستہ بک گئے۔ نثار میاں کو پڑھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بھی قسمت کے ہیٹے ہی نکلے، ایک دکان پر منشی کا کام کرتے ہیں اور بس اپنا ہی پیٹ پال

لیتے ہیں۔ اب تو یہ کھنڈر ہی رہ گیا ہے جو ہمیں کسی طرح سہارا دیئے ہوئے ہے۔ اس پر کچھ قرض ورض مل جاتے ہیں......"۔

بڑے ابا کے جواب سے میری تشفی نہیں ہوئی، لیکن میں نے ان سے وضاحت طلب نہیں کی، ہمت ہی نہیں ہوئی۔ فی الحال میں نے سو رہنا ہی مناسب سمجھا۔

"صبح ابھی میری نیند ٹوٹی بھی نہیں تھی کہ بڑی اماں نے ہولے سے مجھے جگایا،" بیٹا، جنید میاں کا آدمی دو دو بار تمہیں بلانے کے لئے آ چکا ہے، کیا ان کے ہاں جانے کا تم نے وعدہ کیا تھا......؟"

"جنید ماموں کا آدمی......؟ وعدہ......؟"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، بہر حال میں اٹھ گیا اور کپڑے تبدیل کر کے باہر آیا۔ جنید ماموں کا آدمی بیٹھا تھا۔

"حضور، سرکار ناشتے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں......"۔

اس آدمی نے ادب کے ساتھ مجھے اطلاع دی۔ میں نے قدرے تیز لہجے میں جواب دیا۔

"ارے بھائی، ابھی میں کیسے آ سکتا ہوں، مجھے آنے میں......"۔

جنید ماموں کے ہاں پھر ناشتہ پر جانے کا اس وقت کوئی تک ہی نہیں تھا، اس سے تو اچھا تھا کہ میں انہیں کے ہاں ٹھہر جاتا، میں تو بڑے ابا کے ہاں آیا تھا اور مجھے ان کے ساتھ ہی روکھی سوکھی کھانا منظور تھا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"آپ جنید ماموں سے جا کر کہیئے کہ وہ ناشتہ نوش فرمالیں، میں تو ناشتہ کے بعد ہی آ سکوں گا......"۔

اور کچھ سنے بغیر اندر چلا آیا۔

بڑی اماں نے پراٹھے اور ہلدی والی آلو کی بھجیا بنائی تھی اور دھنیئے کی چٹنی۔ یہ ذائقہ بھی میری زبان پر برسوں کے بعد آیا۔ بڑے ابا دھیرے دھیرے نوالے توڑ رہے تھے۔ سر جھکائے جھکائے انہوں نے دریافت کیا۔

"جنید میاں نے تمہیں آج بھی مدعو کیا تھا کیا......؟"

میں نے ہاتھ روک کر غور سے انہیں دیکھا اور قدرے سخت لہجے میں جواب دیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی، انہوں نے ایک عام بات کہی تھی لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے بڑے ابا کہ میں بار بار...... میں یہاں مہمان داری کرنے تو نہیں آیا، میں تو اپنے گھر میں آیا ہوں، آپ کے پاس......''۔

مجھے محسوس ہوا کہ میرے جواب سے بڑے ابا اور بڑی اماں کی بجھتی آنکھوں میں دیے سے جل اٹھے۔ بڑے ابا مسکرا کر بولے۔

''ویسے جنید میاں بھی اپنے ہی ہیں بھائی۔ ان کا گھر بھی تمہارا ہی گھر ہے۔ وہ تمہارے ساتھ اخلاق برت رہے ہیں تو ان کا دل مت توڑو......''۔

میں خاموشی سے کھاتا رہا۔

چائے وائے سے فارغ ہو کر میں بہت دیر تک بڑے ابا کے پاس بیٹھا رہا۔ ان کے پاس دنیا بھر کی باتوں کا ایک ایسا خزانہ تھا جو جتنا خرچ کیا جاتا اتنا ہی بڑھتا جاتا۔ یہی خزانہ کسی دوسرے کی ملکیت ہوتا تو میں اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا لیکن بڑے ابا کے خزانے میں کچھ ایسے انمول رتن بھی تھے جن سے میری آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ نہ صرف آنکھیں بلکہ دل و دماغ اور اندر کی وہ ساری پرتیں، جنہیں میں نے دیار غیر میں پیسوں اور مصلحتوں سے بالکل ڈھک دیا تھا۔ ان انمول رتنوں میں میرے مرحوم والد تھے، والدہ تھیں جنہیں میں زندہ ہنستا ہوا چھوڑ کر گیا تھا نہ جانے کس چیز کی تلاش میں، اور برسوں کی بے پناہ تلاش و جستجو کے بعد بھی میرے دونوں ہاتھ خالی تھے، بلکہ جو کچھ میری مٹھی میں تھا، وہ بھی میں نے کھو دیا تھا۔ ان میں میرے وہ چچا تھے، پھوپھی تھیں، دوسرے قریبی رشتہ دار تھے، جن کی گودوں میں، میں کھیلا تھا اور ان سے اپنی جا و بے جا ضدیں پوری کرائی تھیں، دادا، دادی تھے جنہیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو نہیں تھا لیکن جن کے بغیر میری روح آج بھی سرشار نہیں ہوتی تھی۔

وقت کب آیا، کب گیا، ہمیں پتہ ہی نہیں چلا۔ اس کا اک ذرا سا احساس بس اس وقت ہوا جب بڑی اماں نے شاید میری ہمدردی ہی میں بڑے ابا کو ٹوکا۔

''کتنا بولئے گا، بچہ سنتے سنتے تھک گیا ہوگا، ذرا دم تو لے لیجئے، میں چائے لاتی ہوں......''۔

''نہیں، نہیں بڑی اماں، میں بالکل نہیں تھکا۔ بڑے ابا بولتے ہیں تو ان کی آواز میری

روح اور میرے جسم میں سمائی جاتی ہے، آپ انہیں نہ ٹو کئے......''۔

میں تقریباً چیخ اٹھا۔ بڑے ابا جو بڑی اماں کی دخل اندازی سے قدرے شرمندہ ہو گئے تھے، اچانک جیسے جی اٹھے۔ ان کے چہرے پر سرخی سی آ گئی اور وہ بڑے جوش کے عالم میں بولے۔

''ارے بھائی، اب میرے جیسا بولنے والا بھی انہیں کہاں ملے گا، اب تو بس باتیں ہی رہ گئی ہیں، باقی اللہ ہی اللہ ہے......''۔

بڑی اماں چائے لے آئیں، لیکن باتوں کا سلسلہ جو ٹوٹا تو ٹوٹا ہی رہا۔ چائے پیتے پیتے اچانک بڑے ابا کو خیال آیا۔

''بیٹا، جنید میاں کے ہاں ہو لو، کئی بار تمہیں بلا چکے ہیں، انتظار کر رہے ہوں گے ''۔

سچی بات یہ ہے کہ جنید ماموں کے ہاں جانے پر میرا دل اب آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ ان کے اسٹیریو ٹائپ گفتگو سے جی گھبرا گیا تھا۔ میں نے بھی اس عمر میں بہت دنیا دیکھ لی تھی۔ جنید ماموں کی باتوں میں میرے لئے کچھ بھی نیا نہیں تھا، پھر بھی میں یہاں کسی سے بگاڑ کرنے تو آیا نہیں تھا، پرانے رشتوں کو مضبوط ہی کرنے آیا تھا اور جنید ماموں بھی آخر اسی سلسلے کی ایک کڑی تھے۔

جنید ماموں مجھے دیکھتے ہی لہک اٹھے۔

''بھانجے میاں، صبح سے آپ کے انتظار میں سوکھ رہا ہوں، دیکھئے ناشتے کی ٹیبل ابھی بھی بھری پڑی ہے۔''

میں نے ایک اچٹتی سی نگاہ ان کے وسیع ڈائننگ ٹیبل پر ڈالی، وہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ ساری پلیٹیں تقریباً بھری ہوئی تھیں، شاید انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا تھا، یا لگایا گیا تھا تو بہت کم چیزیں اٹھائی گئی تھیں۔

''آپ نے کھالیا ہوتا ماموں، ناحق میرے انتظار میں کیوں رہے......؟''

میں نے شرمندگی کا اظہار کیا۔ جنید ماموں مسکرائے۔

''میں نے کچھ چکھ تو لیا ہے، لیکن ایک آدمی کتنا کھا سکتا ہے بھلا؟''

''تو آپ کیا سمجھ رہے ہیں جنید ماموں، میں وہاں سے بالکل پھکڑ ہی آیا ہوں اور میری غذا دیو کی غذا ہے؟''

میں نے ناراضگی کے انداز میں دریافت کیا۔ جنید ماموں نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ

رکھ دیا۔

''ارے نہیں بھائی، خدانخواستہ ہم ایسا کیوں سمجھنے لگے، لیکن تم مہمان ہو نا، تمہاری پسند کی بہت ساری چیزیں تمہاری ممانی نے تیار کرائی تھیں، جو تمہیں پسند آجائے......''۔

میں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''ماموں، مجھے بار بار مہمان کہہ کے شرمندہ نہ کیجئے۔ میں اپنے گھر میں آیا ہوں، یہ احساس میرے اندر زندہ رہنے دیجئے۔ آپ کی اور ممانی کی محبت ہے کہ آپ لوگ میری پسند ناپسند کا اتنا خیال رکھتے ہیں، ورنہ مجھے تو اپنے گھر کی سوکھی روٹی بھی من وسلویٰ سے زیادہ عزیز ہے''۔

''پھر بھی، اب اتنی چیزیں تیار ہو ہی گئی ہیں تو تمہیں کچھ تو لینا ہی ہوگا......''۔

ممانی نے کچھ اس انداز میں کہا کہ میں ٹیبل تک جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ایک بار پھر ضرورت سے زیادہ اہتمام کر ڈالا تھا۔ لیکن میں بڑے ابا کے ساتھ سیر شکم ہو چکا تھا، کھانے کی بالکل گنجائش نہیں تھی، پھر بھی میں نے محض ان کی خاطر اکا دکا چیز اٹھا کر منہ میں رکھ لیں۔

ابھی ہم لوگ بیٹھے ہی تھے کہ ایک نہایت خوبصورت لڑکی ایک وہیل چیئر کو ڈھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی جس پر معمولی شکل وصورت کا ایک نوجوان براجمان تھا۔ جنید ماموں انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''ارے بھائی، تم پچھلی بار آئے تو اپنی بہن اور بہنوئی سے نہیں مل سکے، آج میں نے انہیں خاص طور پر تم سے ملنے کو بلوایا ہے......''۔

لڑکی نے مجھے سلام کیا اور نوجوان نے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ بہت ٹھنڈا اور ٹھٹھرا ہوا ہاتھ تھا۔ اس کے چہرے پر مجھے کوئی تاثر نہیں دکھا، صرف ایک پھیکی سی مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔

فوری طور پر میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ میں کس طرح اپنا تاثر ظاہر کروں، آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی، وغیرہ قسم کے جملے دہرانے کا یہاں کوئی موقع نہیں تھا۔ بہر کیف میں اپنے اندرونی جذبات کو دبانے میں اس حد تک ضرور کامیاب ہوا کہ میرے چہرے پر پڑھنے کے لائق کوئی تاثر نہیں اُبھر سکا اور اس مسکراہٹ کا، جسے میں اپنے ہونٹوں پر امریکہ سے سنبھالے

کسی طرح یہاں تک لے آیا تھا، دل کھول کر مظاہرہ کرنے کا موقع ملا۔

جنید ماموں نے بڑے مسرور لہجے میں اپنے داماد کا تفصیلی تعارف کرایا۔

''ساجد بابو...... خان بہادر اللہ دین کے پوتے، ان کے والد صاحب بھی شہر کے نامی وکیل ہیں، بہت مشہور اور بڑا خاندان ہے، ان کے ہاں وزیر اعظم تک آ چکے ہیں، سمدھی صاحب اگلے چناؤ میں انشاءاللہ پارلیامنٹ کے ممبر ہو جائیں گے......''۔

جنید ماموں تعارف کراتے ہوئے مسلسل اپنی خوبصورت بیٹی کی طرف دیکھ رہے تھے جو مسکرا تو رہی تھی لیکن اس کی مسکراہٹ کو پڑھنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے بہت سی ندیوں کا پانی پی کر ایسی بہت سی مسکراہٹیں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں اور محسوس کی تھیں۔ بہرکیف یہ ان کا اپنا مسئلہ تھا، اس وقت تو فکر مجھے اپنی مسکراہٹ کی تھی جس میں، میں کسی قیمت پر کوئی فرق نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔ بقول جنید ماموں، میں یہاں مہمان تھا اور مجھے جلد ہی یہاں سے چلا جانا تھا۔

ساجد بابو پوری گفتگو میں تقریباً خاموش رہے۔ کبھی کبھار ان کے منہ سے ہوں ہاں نکل جاتا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ شاید وہ بولنا نہیں جانتے۔ باتوں باتوں میں جنید ماموں نے بتایا کہ ساجد بابو کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، ان کے گھر میں اتنی دولت ہے کہ اگلے سات پشتوں تک کسی کو کمانے کی ضرورت نہیں، یوں وقت گزاری کے لئے یہ لوگ کوئی نہ کوئی معزز شغل اختیار کرتے رہتے ہیں جیسے ان کے والد صاحب نے وکالت کے پیشے کو اپنایا اگرچہ وہ اس میں بھی ٹاپ پر جا پہنچے۔

جنید ماموں اور ممانی کی باتوں سے دُور دُور تک اس کا اندازہ نہیں ملا کہ انہیں اس رشتے کا رتی برابر بھی افسوس ہو، بلکہ وہ کچھ زیادہ ہی خوش نظر آئے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے جانے کی اجازت چاہی تو جنید ماموں بضد ہو گئے کہ کھانا کھا کر ہی جانا ہوگا، لیکن اتنی دیر میں پتہ نہیں میرے اندر کون سا اُبال آ گیا تھا کہ میں نے سارے تکلّفات کو بالائے طاق رکھ کر صاف انکار کر دیا۔ شاید میرے انکار میں اتنی شدت تھی کہ جنید ماموں زیادہ زور نہیں ڈال سکے، البتہ انہوں نے یہ وعدہ ضرور لیا کہ میں ایک بار پھر ان کے ہاں کھانے پر آؤں گا اور یہ بات پہلے سے طے ہو جائے گی۔

بڑے ابا نے مجھے خاموش پا کر پوچھا۔

''سب خیریت ہے نا بیٹا؟ جنید میاں کے ہاں اور لوگ بھی تھے؟''

''جی ہاں، سب خیریت ہے، کوئی خاص لوگ نہیں تھے، بس یونہی......''۔

پتہ نہیں کیوں، میرا جی نہیں چاہا کہ بڑے ابا سے اس موضوع پر باتیں کروں، میری طبیعت مکدر ہوگئی تھی۔ میں چپ چاپ منہ لپیٹ کر لیٹ رہا۔ بڑی اماں نے کھانے کو پوچھا تو طبیعت میں گرانی کا بہانہ کر دیا۔

شام کو دیر تک سو کر اٹھا تو تکدر کسی حد تک دور ہو گیا تھا۔ بڑے ابا چائے پر میرے منتظر تھے۔ بڑی اماں نے دریافت کیا کہ چونکہ میں نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا اس لئے کیا کچھ ناشتہ بنادوں؟ میں نے معذرت کر لی کہ اب رات ہی میں کھانا کھاؤں گا۔

چائے پیتے ہوئے بڑے ابا غور سے مجھے دیکھتے رہے۔ میں نظریں چراتا رہا۔ چائے کے خاتمے پر انہوں نے آہستہ سے دریافت کیا۔

''جنید میاں نے اپنے داماد سے بھی تم کو ملوایا؟''

میں چونک گیا۔ تو گویا بڑے ابا بات کی تہہ تک پہنچ گئے، میں نے جواب دیا۔

''بڑے ابا، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جنید ماموں کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ ان کی لڑکی بھی خوبصورت تھی، پھر انہیں کیا پڑی کہ ایک معذور لڑکے سے انہوں نے اس کی شادی کر دی، اس پر سے وہ بہت خوش بھی دکھائی دیتے ہیں......؟''

بڑے ابا ہنسے، پھر اپنی ہنسی پر قابو پا کے بولے۔

''پتہ نہیں، اتنے دنوں امریکہ اور یورپ میں رہنے کے بعد یہ بات تمہاری سمجھ میں آئے گی یا نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے بلکہ جو کچھ بھی ہے، اس میں بھی دن دونی، رات چوگنی اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ہاں، بس ایک چیز کی کمی ہے جسے شاید انہوں نے اس خاندان میں رشتہ جوڑ کر پورا کرنے کی کوشش کی ہے......''۔

پتہ نہیں بڑے ابا دانستہ خاموش ہو گئے یا بولتے بولتے تھک گئے تھے لیکن نہیں...... وہ تھک کیسے سکتے تھے، وہ تو گھنٹوں بے تکان بول سکتے تھے، میں نے کچھ دیر ان کے بولنے کا انتظار کیا، پھر دریافت کیا۔

''کون سی کمی بڑے ابا......؟''

بڑے ابا خاموش رہے، لیکن ان کا انداز یہ تھا کہ وہ جواب دینے کو پر تول رہے ہیں، میں منتظر رہا۔ آخر بڑے ابا نے کھنکھار کر اپنا گلہ صاف کیا۔

''شاید تمہیں نہیں معلوم بیٹا کہ جنید میاں دوسری لائن سے ہمارے خاندان میں داخل ہوئے ہیں یعنی ان کی ماں......''۔

''بڑے ابا، ان باتوں کی اب کون سی اہمیت ہے۔ آج کی دنیا میں کون پوچھتا ہے کہ بھیا تم ہو کون؟ پھر جنید ماموں نے تو وہ سب کچھ حاصل کر لیا ہے جو ایک کامیاب آدمی کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہیں۔ پھر......؟''

میں نے بڑے ابا کی بات درمیان میں کاٹ دی۔ میں ان سے اتنی تفصیل سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

بڑے ابا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''میں نے کہا نا کہ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گے، دراصل جنید میاں کو ساری دنیا میں اُڑنے کے لئے ایک مضبوط کھونٹا چاہئے تا، اس چیز کو وہ حاصل نہیں کر سکے۔ اس کے لئے انہوں نے اپنی ایک اولاد کی قربانی دے دی۔ اگلی نسل سے اب ان کے پاس اتنا مضبوط کھونٹا ہو جائے گا جو کسی کے پاس نہیں ہوگا۔ ان کے نواسے خان بہادر اللہ دین کے خاندان کے بچے کہے جائیں گے۔ اس وقت ان کے پاس ساری دنیا میں اُڑنے کے لئے پر ہو جائیں گے......''۔

بڑے ابا چپ ہو گئے۔ میں ان کی طرف دیکھتا رہا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ ان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں البتہ میں ان میں کوئی معنی کی تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔

رات میری خاصی بے چینی میں کٹی، پتہ نہیں پر اسرار اور بے حد الجھے ہوئے سوالوں کے کس بھنور میں، میں پھنس گیا تھا۔

سوال......جن سے براہ راست میرا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن میں ان سے بالکل لاتعلق بھی نہیں تھا۔ سارے سوال میرے منہ پر جیسے طمانچے کی شکل میں مارے جا رہے تھے۔ میں جو دنیا کے بیشتر ممالک میں گھوم گھوم کر ایسے ٹیڑھے ٹیڑھے سوالوں کو حل کر چکا تھا جن کا جواب پانے میں بڑے بڑے ناکام رہے تھے، میں مشکل مرحلوں میں بڑے چاؤ اور امیدوں کے ساتھ بلایا جاتا تھا

اور یہ بھی اتفاق تھا کہ میں ان کی توقعات پر کھرا اتر آتا تھا، لیکن جنید ماموں کے حالات نے تو میرے تیز وطرار دماغ کو بالکل چکرا کے رکھ دیا تھا۔

رات بھر بے معنویت کے سمندر میں بار بار غوطہ لگا کر معنی کے موتی تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

رات بھر مہملات کے جنگل میں گم ہو کر اس بے معنی سچویشن کا کوئی عنوان تجویز کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

کچھ حاصل نہیں ہوا۔

بار بار میرے سامنے جنید ماموں کا خوش وخرم چہرہ اُبھر آتا تھا، پھر ڈوب جاتا تھا۔ ان کی خوبصورت لڑکی کا مسکراتا ہوا چہرہ ابھرتا تھا، ڈوبتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ مونالیزا کی مسکراہٹ تھی جس کے آج تک معنی تلاش کئے جا رہے ہیں۔

میرے ذہن کے کئی گوشے سے وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا ان کا داماد جھانکتا تھا جو چلنے پھرنے سے معذور تھا ہی، شاید اسے بولنا بھی نہیں آتا تھا، وہ جب بھی کچھ بولنے کی کوشش کرتا، اس پر ہکلاہٹ کا ایسا دورہ پڑ جاتا کہ اس کے منہ سے ادا ہونے والے الفاظ تیز ندی میں کاغذ کی ناؤ کی طرح بہہ جاتے۔

میری زندگی کا یہ پہلا موقع تھا جب میں کسی سچویشن کو معنی اور عنوان دینے میں بری طرح ناکام رہا۔ احساس شکستگی نے میری آنکھوں کی نیند اُڑا دی اور بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے میری رات بیت گئی۔

میں یہاں کسی مقررہ مدت کے لئے نہیں آیا تھا، خیال تھا کہ دو چار روز یہاں رہوں گا، پھر واپسی کا دیکھوں گا لیکن میں دو ہی دن میں اُوب گیا۔ بڑے ابا بھی اپنی باتوں کا سارا خزانہ مجھ پر لٹا چکے تھے اور وہ اب اپنی کہی ہوئی باتوں کو دُہرانے کے موڈ میں تھے۔ میں نے ان سے جانے کی اجازت مانگی تو وہ اچانک بے حد سوگوار ہو گئے، ان کی آنکھیں بھر آئیں، میں ان کی کیفیت کا بغور مطالعہ کرتا رہا لیکن سوال یہ تھا کہ میں کوئی جذباتی دنیا کا آدمی تو تھا نہیں، جذبات کے ایک دُور افتادہ جھونکے میں یہاں آنکلا تھا مگر جھونکا تو جھونکا ہی ہوتا ہے۔

بڑے ابا تھوڑی دیر کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

''بیٹا میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم بہت مصروف آدمی ہو اور تم نے اپنے نہایت قیمتی وقت کا ایک حصہ محض ہماری محبت میں نکالا ہے۔ چار دنوں کے بعد بقرعید ہے۔ پتہ نہیں اب کب تمہارا آنا ہو اور جب ہو تو میں زندہ رہوں یا نہیں۔ میری خواہش ہے کہ تم بقرعید کی نماز ہمارے ساتھ ہی پڑھتے......''۔

پتہ نہیں بڑے ابا کی التجا یا حکم میں کون سا جادوئی تاثر تھا کہ میری دنیا بھر کی مصروفیتیں اور سونے کے بھاؤ تلنے والے میرے اوقات ان کے سامنے بے وزن ہو گئے اور میری زبان سے ایک لفظ نہیں نکل سکا۔

جنید ماموں بھی اپنے کینڈے کے ایک ہی آدمی تھے۔ میرے پروگرام کی انہیں باضابطہ کوئی جانکاری نہیں تھی، پھر بھی صبح صبح ان کا خاص آدمی مجھے لینے پھر آ پہنچا۔ میں جھنجھلا کر اسے کوئی سخت جواب دینے ہی والا تھا کہ بڑے ابا نے میرے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں بیٹے، جنید میاں تم سے محبت سے پیش آتے ہیں تو تم بھی ان کی قدر کرو۔ تم بھی نئے زمانے کے آدمی ہو اور وہ بھی، بلکہ وہ تو آنے والے زمانے کے آدمی بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے مستقبل کی روشن لکیریں کھینچی ہیں......''۔

''لیکن بڑے ابا، مجھے ان کے مستقبل سے کیا لینا دینا۔ میں تو آپ سے ملنے آیا ہوں اور آئندہ بھی آپ ہی سے ملنے آؤں گا......''۔

میں نے احتجاج کیا۔ بڑے ابا حلیمی سے مسکرائے۔

''وہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ آئندہ جب تم یہاں آؤ گے تو میں نہیں رہوں گا، جنید میاں رہیں گے، ان کی اولاد رہے گی اور وہی تمہارے میزبان ہوں گے......''۔

میں پھر اپنا احتجاج درج کرانے ہی والا تھا کہ بڑے ابا نے جنید ماموں کے بھیجے ہوئے آدمی کو اندر بلا کر کہا۔

''صاحب سے کہہ دینا، بابو ناشتہ کے بعد جائیں گے اور کھانا وہیں کھائیں گے......''۔

میں نے بوکھلا کر بڑے ابا کی طرف دیکھا۔

اپنے آدمی کی معرفت بڑے ابا کی شہ پا کر جنید ماموں نے دوپہر کے کھانے میں کچھ زیادہ ہی اہتمام کر ڈالا تھا۔ اہتمام ان معنوں میں کہ انہوں نے کئی لوگوں کو بلا رکھا تھا اور کمال ہے

کہ اتنی جلدی انہوں نے سارا انتظام کرلیا تھا۔

ان کے مہمانوں میں دو آئی اے ایس تھے، ایک آئی پی ایس، تین انکم ٹیکس کے افسر اور پانچ ممبران ایوان ساز۔ جنید ماموں کو حیرت انگیز طور پر غیر ملک میں میری اصل حیثیت کی پوری پوری جانکاری تھی، اس کے باوجود میرے تعارف میں انہوں نے کافی مبالغہ آمیزی سے کام لیا اور مجھے اقوام متحدہ کا مشیر تک بتا دیا۔ میں نے بہت چاہا کہ ان کی باتوں کی تردید کردوں لیکن پتہ نہیں ان کے چہرے پر کیا لکھا تھا اور میری آنکھوں کو کیا نظر آرہا تھا کہ میری زبان اندر اندر گنگ ہو کر رہ گئی۔ اسی وقت یہ حقیقت بھی میرے سامنے کھلی کہ اپنے چہرے پر لکھی اس پراسرار تحریر سے وہ دنیا کو اپنے قابو میں کرتے رہتے ہیں۔

جنید ماموں اپنے مہمانوں کی خاطر میں بچھے جا رہے تھے۔ دوران گفتگو وہ بار بار خان بہادر اللہ دین سے اپنے خاص رشتے کا ذکر کر رہے تھے، خاص طور پر یہ کہ وزیر اعظم جب بھی اس شہر میں تشریف لائے، خاں بہادر کے ہاں ضرور گئے۔ سارے لوگ ان کی گفتگو سے کافی مرعوب نظر آتے تھے۔ حالانکہ وہ سب یقیناً جنید ماموں کے پرانے جانکاروں میں ہوں گے اور جنید ماموں نے پہلے بھی ان سے یہی باتیں کہی ہوں گی۔ لیکن اس وقت ''اقوام متحدہ'' کے ایک مشیر کے سامنے کی یہ گفتگو سونے پر سہاگہ کا کام کر رہی تھی۔

جنید ماموں نے دعوت کے خاتمے پر سب کی خدمت میں قیمتی تحائف بھی پیش کیے۔ خاص بات یہ کہ اور لوگوں کو تحفے میرے ہاتھوں دلوائے گئے اور مجھے سب سے سینئر حاکم کے ہاتھوں۔ ان کے سارے پروگرام پہلے سے طے شدہ تھے۔ وہ ایک بہترین منتظم تھے۔ جو آدمی اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھے کہ اس کا کون مہمان ٹھنڈا پانی پیتا ہے اور کون نیم گرم، اس کے منتظم اعلیٰ ہونے میں کیا شک ہے۔

جنید ماموں روزانہ ہی کوئی پروگرام بنا لیتے۔ کبھی کلب، کبھی ہوٹل کی پارٹیاں، کبھی کسی کی سال گرہ پارٹی...... میری شکل میں ایک نادر کھلونا ان کے ہاتھ آگیا تھا جسے وہ دوسروں کو دکھا دکھا کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ میں ان چیزوں سے اکتا گیا تھا، جنید ماموں بس ایک آدھ روز کے لئے ہی اچھے لگتے تھے، اس کے بعد وہ بوریت کا پہاڑ بن جاتے تھے۔ لیکن کچھ بڑے ابا کا حکم، کچھ مروت اور کچھ حالات کی جکڑ بندی نے مجھے مجبور کر رکھا تھا کہ اس پہاڑ کو اپنے سر پر ڈھوتا رہوں۔

جنید ماموں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ خواہ مخواہ لوگوں میں دھنس جاتے تھے، خاص طور پر ان لوگوں میں جن سے راہ و رسم بڑھانا ان کا مقصود ہوتا یا پھر جن سے انہیں کام پڑتا تھا۔ وہ لوگوں سے دل کھول کر ملنا جانتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ اپنی کچھ لغو بے معنویت کو تج دیں تو وہ اور ترقی کر سکتے ہیں۔ میرے اندر تو ان جیسی خصوصیات نہیں تھیں تو میں نے اتنی ترقی کی کہ مجھے ''اقوام متحدہ'' کا مشیر تک کہا جانے لگا، میری جگہ پر وہ ہوتے تو کیا ہوتے؟

بقر عید کی رات بڑے ابا کے ہاں عجیب سماں تھا۔ ان کی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ وہ قربانی کے لئے جانور خرید سکتے۔ میں یہ کام کر سکتا تھا لیکن یہ خیال مجھے عید کی رات ہی میں آیا اور میں کف افسوس مل کر رہ گیا۔ کسی نے مجھے توجہ بھی نہیں دلائی اور خود میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات نہیں آئی۔ یہی ہوتا ہے جب اپنی ہی زمین سے آدمی کے قدم اکھڑ جاتے ہیں تو پھر ہواؤں میں ڈولتے رہنے کے سوا اسے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ بڑی اماں نے پرانے صندوقوں سے بچے کھچے حواس باختہ قالین کے ٹکڑے اور بوسیدہ چاندنیاں چوکیوں اور پلنگوں پر پھیلا دیں۔ ان پر جا بجا کیڑوں نے اپنا ہاتھ صاف کیا تھا۔ پھر بھی ان میں کچھ چمک دمک باقی تھی۔ دھوپ، پانی اور گرد کھائی ہوئی کاٹھ کی کرسیوں کو بھیگے کپڑوں سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا گیا، دو تین ٹوٹے ہوئے بنچوں کے پائے میں اینٹیں رکھ کر انہیں بیٹھنے کے لائق بنایا گیا۔ ان تمام عمل میں، ان کے منع کرنے کے باوجود میں نے بھی اپنا ہاتھ بٹایا لیکن ایک سوال بار بار میرے ذہن میں چکر لگاتا رہا کہ اتنا انتظام کیوں کیا جا رہا ہے، بڑے ابا سے ملنے کو آخر اتنے لوگ کہاں سے اور کیوں آجائیں گے......؟

عید گاہ کا منظر بھی دلچسپ تھا۔ نماز کے بعد لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بڑے ابا سے ملتے رہے۔ لوگوں سے ملتے ملتے ان کے بازو شل ہو گئے۔ کمزور جسم اور مضمحل ہو گیا۔ ہر آدمی جیسے تبرکاً انہیں چھو دینا چاہتا تھا۔ وہاں جنید ماموں بھی تھے، ان سے بھی لوگ مل رہے تھے۔ نہیں، جنید ماموں لوگوں سے مل رہے تھے۔

ہم گھر واپس آئے تو وہاں گوشت کے ڈھیر لگے تھے، میری آنکھوں میں حیرانی دیکھ کر بڑی اماں مسکرائیں۔

''کیا کریں، لوگ اتنا بھیج دیتے ہیں کہ پھر ہمیں بھی دوسروں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے، یہاں اتنا کھانے والا بیٹھا کون ہے، خوش قسمتی سے تم آ گئے ہو تو......''۔

بڑے ابا نے ان کی بات کاٹتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

''جاؤ بیٹا، جنید سے بھی مل لو، تمہارے انتظار میں بے چین ہوں گے......''۔

مجھے بھی شام کی پلین سے لوٹنا تھا اس لئے مناسب یہی تھا کہ میں ان سے اسی وقت مل ہی آؤں۔ پھر سارا وقت بڑے ابا کے ساتھ گزاروں گا۔

جنید ماموں واقعی میرے انتظار میں تھے بلکہ وہ اپنے خاص آدمی کو پھر بھیجنے ہی والے تھے۔ مجھ سے ایک بار پھر گرمجوشی سے معانقہ کرنے کے بعد وہ فون پر جا بیٹھے۔ وہ شہر کے سارے حکام اور سرکردہ لوگوں سے رابطہ قائم کر کے انہیں عید کی مبارک باد کے ساتھ ساتھ رات کے کھانے پر مدعو کرتے رہے۔ یہ جان کر انہیں سخت مایوسی ہوئی کہ میں آج ہی واپس جا رہا ہوں، انہوں نے مجھ پر بہت زور ڈالا کہ کم سے کم ایک دن اور رُک جاؤں لیکن میرے لئے اب ایک لمحہ رکنا بھی محال تھا۔ اتنے دن رک گیا تو محض بڑے ابا کی آنکھوں کی نمی کی بنیاد پر۔ البتہ جنید ماموں کو میں نے اپنے ہاں آنے کی دعوت ضرور دی۔

''ماموں، آپ کو اللہ نے ہر طرح سے نوازا ہے، اب پیسے کا کچھ مصرف بھی لیجئے اور دنیا دیکھنے سے بڑھ کر پیسے کا اور کیا مصرف ہو سکتا ہے......''۔

جنید ماموں کچھ سوچتے رہے، پھر ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

''بات تو تم ٹھیک کہتے ہو میاں، لیکن میں یہاں کچھ زمینی مصروفیتوں میں لگا ہوا ہوں، ان سے فرصت ملی تو ضرور آؤں گا......''۔

بڑے ابا کے ہاں ایک حیرت انگیز نظارہ میرا منتظر تھا۔ وہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی، بیٹھنے کے سارے انتظامات ناکافی پڑ گئے تھے۔ خدا معلوم کہاں سے اتنے لوگ اُمڈ آئے تھے۔ بڑے ابا کے پاس ان کی تواضع کے مناسب ذرائع بھی نہیں تھے، وہ سپاری اور الائچی پیش کر رہے تھے اور عطر کی شیشی۔ لوگ آ رہے تھے، جا رہے تھے۔

اچانک میرے ذہن کا وہ گوشہ منور ہو گیا جو مبہم، لایعنی سوالوں کے جال سے گنجلک ہو گیا تھا جس کے سبب مجھے اس رات، رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔

شکر ہے کہ میں مطمئن واپس جا رہا تھا۔

✠ • ✠ • ✠

لمس

وہی تھا...... بالکل وہی......

اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا، آنکھیں جھکی ہوئی، پہلی نگاہ میں اسے فوراً پہچان جانا آسان نہیں تھا لیکن میں جو اس کے چہرے، اس کی آنکھیں اور اس کی شخصیت سے پرے بھی اسے جانتی تھی، اسے نہیں پہچاننے کی بھول کیسے کر سکتی تھی۔

وہ اپنا بڑا سا سوٹ کیس تھامے، اپنے اطراف سے بے خبر بڑی بے نیازی کے عالم میں آگے بڑھ گیا تو میں وقت کی مضبوط مٹھی سے آزاد ہوئی اور اپنے آپ کو اپنے دروازے پر کھڑا پایا۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں نے کس کام کے لئے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا تھا۔ عالم کے دفتر جانے کے بعد اس کا دروازہ زیادہ تر بند ہی رہتا۔ سبزی، دودھ اور روزمرّہ کی ضروریات کی ساری چیزیں عالم صبح صبح لے آتے تھے، ملنے جلنے والے بھی شام ہی کو آتے۔ میں اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں اس قدر مصروف رہتی کہ دن میں دروازہ کھولنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ پھر یہ دروازہ میں نے کس لئے کھولا تھا؟

نہ کھولتی تو روز کی طرح کس قدر چین سے رہتی، کھول کر جی کا کتنا بڑا جنجال میں نے مول لے لیا......۔

دروازے پر کھڑی کھڑی چور نگاہوں سے میں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ تین چار فلیٹوں کے بعد ایک فلیٹ کی چابی اس نے کھولی۔ یہ فلیٹ بہت دنوں سے بند پڑا تھا۔ گویا وہ اس فلیٹ میں آیا ہے۔ یعنی مصیبت کی شروعات ہونے والی ہے۔ ابھی تو اس سے نگاہیں بھی چار نہیں ہوئیں۔ وہ جانتا بھی نہیں ہوگا کہ میں اس کے پڑوس میں رہتی ہوں۔ لیکن اب تو روز نگاہیں چار

ہوں گی، روز دیکھا دیکھی ہوگی، رسمی جملوں کا روز تبادلہ ہوگا...... کیسے ہوگا یہ سب......؟

دروازہ کھول کر سوٹ کیس اس نے اندر گھسیٹ لیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ تب میں بھی اپنا دروازہ بند کر کے اندر آ گئی۔

کتنے دنوں کے بعد اس پر نگاہ پڑی تھی۔ اس کے بارے میں کبھی کوئی جانکاری بھی نہیں ملی۔ شروع شروع میں اس کے بارے میں سوچ کر ایک ہوک سی اٹھتی تھی، خواہش ہوتی اس کے بارے میں کسی سے پوچھوں اور اس کے بارے میں کوئی کچھ بتائے۔ لیکن عالم نے اپنے پیار سے میرے جسم، میری سوچ، میرے تصورات اور میری تمام کچی پکی خواہشوں کو یوں گھیر رکھا تھا کہ فرار کی کوئی گنجائش کہیں باقی نہیں بچی تھی۔ عالم جیسا شریک سفر قسمت والوں کو ملتا ہے اور اس معاملے میں، میں یقیناً قسمت والی تھی۔ اس وقت بھی قسمت نے مجھ پر ایک مہربانی ہی کی تھی۔ پڑوس میں اس کی آمد کی جانکاری قبل از وقت دے دی تھی۔ مجھے سوچنے کا، طے کرنے کا ڈھیر سارا وقت مل گیا تھا کہ اس سے اچانک سامنا ہو تو مجھے کون سا رویہ اختیار کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں ایک محبت کرنے والے شوہر کی بیوی تھی اور وہ......

وہ میری رشتے کی ایک بہن کا دور کے رشتے کا دیور تھا۔ ہمارے پڑوس میں رہتا تھا، یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ میں انٹرمیڈیٹ کی طالبہ تھی اور اتفاق سے اسی مضمون میں کمزور تھی جس میں وہ ایم۔اے کر رہا تھا۔ مجھے ایک ٹیوٹر کی سخت ضرورت تھی۔ بابا کو ایک جوان لڑکے کو رکھنے میں ہچکچاہٹ تھی۔ بہت تلاش کے بعد بھی کوئی ٹیوٹر نہیں مل سکا اور میری بہن نے بھی اس کے لئے بار بار زور ڈالا تو بادل ناخواستہ اسے رکھ لیا گیا۔ ہمارا گھر تھوڑا قدامت پسند تھا، لڑکی کو ٹیوٹر پر بالکل چھوڑ نہیں دیا جاتا تھا اور اس پر کئی خفیہ نگاہیں لگی رہتی تھیں۔ لیکن اس کا انداز اس قدر شریفانہ بلکہ فدویانہ رہا کہ کچھ ہی دنوں میں نگاہوں کے سارے خفیہ کیمرے ہٹا لئے گئے لیکن وہ جو کہا ہے کسی نے آگ اور پانی یکجا نہیں رہ سکتے۔ پڑھنے بلکہ لکھنے کے دوران ہاتھ ہاتھ سے مس ہوئے تو جسم میں ایک کرنٹ سا دوڑنے لگا۔ اس کے چہرے پر بھی ایک رنگ آ جاتا۔

اٹھنے بیٹھنے میں جسم کا کوئی حصہ چھو جاتا تو ایک سنسنی سی دوڑ جاتی۔

اس کے جسم میں بھی ایک کپکپی سی محسوس ہوتی۔

پھر کرنٹ، سنسنی، اڑتے ہوئے رنگ، کپکپی، نہایت خاموشی سے اور لاشعوری طور پر

ضرورت بنتے گئے کہ نہ ہوتے تو سخت کمی سی محسوس ہوتی۔ کبھی دانستہ یا نادانستہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیے جاتے تو دیر تک ان کے لمس کی خوشبو روح میں بوند بوند اترتی رہتی۔ کبھی جسم سے جسم ٹکرا جاتے تو لذت کی کلی جسم و جاں میں دھیرے سے اتر جاتی اور اندر اندر پھول بن کر ہر چہار طرف اپنی خوبصورتی بکھیر دیتی۔ کبھی باتیں کرتے ہوئے آنکھیں ایک دوسرے میں اترنے کی کوشش کرتیں تو اڑتے ہوئے لفظ ساکت ہو جاتے اور جذبوں کو وہ زبان عطا ہو جاتی جو ترسیل کی فتح یابیوں سے سرشار ہوتی۔

ابھی ان جذبوں، لمس اور بے زبانی کی زبان کو کوئی مفہوم عطا بھی نہیں ہوئے تھے کہ میں معنی و مفہوم کی ایک بھری پری دنیا میں اتار دی گئی۔ چھوٹنے کا ملال ضرور ہوا لیکن ہمارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہوا تھا جس کے سبب آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں میں نمک کی آمیزش ہوتی۔ عالم بے پناہ محبت کرنے والے شوہر ثابت ہوئے۔ ان کی جو نگاہ بھی مجھ پر اٹھتی، وہ محبت سے لبریز ہوتی۔ ان کے قدم جب بھی اٹھتے ان کا رخ میری طرف ہوتا۔ وہ میری چھوٹی سی چھوٹی ضرورت اور ادنیٰ سے ادنیٰ جذبے کا یوں خیال رکھتے کہ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ میرے ہاتھ پاؤں میرے نہیں ہیں، عالم کے ہیں۔ میری ضروریات میری نہیں، میرے جذبات، میرا ذہن، میری سوچ، میرا پورا جسم...... سب عالم کے اور میں...... میں پوری کی پوری عالم میں مدغم ہو چکی ہوں۔ مجھ کو ڈھونڈنا ہو تو عالم میں ڈھونڈو، ملنا ہے تو مجھ سے عالم میں ملو۔

عالم کے بھرپور لمس اور جذبات سے گرم سانسوں کے درمیان پتہ نہیں کیوں کبھی کبھی کسی کونے سے اس کا چہرہ جھانک پڑتا۔ بس ایک جھلک اور پلک جھپکتے ہی غائب۔ اس کے اچٹتے ہوئے لمس یاد آتے، اس کی آنکھوں کی نمی چپکے سے میری آنکھوں میں اُتر آتی۔ ایسا کیوں ہوتا، میں سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس کے فوراً ہی بعد مجھ پر شرمندگی کا ایک دبیز احساس طاری ہو جاتا۔ بہت دیر تک طاری رہتا اور میں ایک زبردست نامعلوم بے چینی کا شکار رہتی۔ ظاہر ہے کہ عالم کے رہتے ہوئے کسی دوسرے کا خیال آنا میرے لئے کتنا سوہان روح تھا، لیکن کبھی کبھی آدمی کا اپنے آپ پر بس نہیں ہوتا۔

عالم شام کو دفتر سے لوٹتے تھے۔ ان کے آنے میں ابھی کافی وقت تھا اور میرے پاس بھی سوچنے کا۔

پہلے تو میں نے سوچا اس معاملے کو گول ہی کر جاؤں۔ اس کو سرے سے پہچانوں ہی نہیں۔ یوں بھی یہ شخص اتنا کم آمیز ہے کہ سر جھکائے جھکائے سارا وقت کاٹ دے گا۔ نہ اس کی زبان کھلے گی نہ اس کی آنکھوں میں کوئی چمک کوندے گی۔

دوسرے ہی لمحہ مجھے احساس ہوا کہ خاموشی کا میرا یہ رویہ عالم کے ساتھ میری وفاداری پر حرف لائے گا۔ دنیا کی نگاہوں میں نہ سہی، میری نگاہوں میں تو یقیناً، میں عالم کو سب کچھ بتا دوں یہی بہتر ہے۔ یوں بھی وہ پڑوس میں آ گیا ہے تو آتے جاتے سامنا تو ہوگا ہی۔ میں لاتعلق بننے کی کوشش بھی کروں، کیا ضروری ہے کہ وہ بھی لاتعلق بن جائے اور کیا ضروری ہے کہ میری آنکھوں میں اسے دیکھ کر کوئی رمق پیدا نہ ہو۔ عالم یوں بھی حرکات و سکنات اور پتلیوں کی جنبش کو خوب پڑھتے ہیں۔ ان سے یہ بات کبھی چھپی نہیں رہ پائے گی۔ چنانچہ اس بابت انہیں بتا ہی دیا جائے۔ اس فیصلے پر پہنچ کر مجھے یک گونہ سکون سا محسوس ہوا۔

عالم آئے۔ چائے وائے کے بعد خوشگوار باتوں کا حسب معمول سلسلہ شروع ہوا تو میں نے کہا، ''سنا تم نے عالم، ہمارے پڑوس میں وہ صاحب آ گئے ہیں جو کبھی ہمارے پڑوسی ہوا کرتے تھے اور جن سے میں ٹیوشن پڑھتی تھی''۔

''واہ، یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ کوئی تو ہو جس سے تم میری غیر موجودگی میں اپنے دل کو ہلکا کر سکو......''۔

عالم بہت خوش دلی سے بولے۔ مجھے ان کی مسکراہٹ اور الفاظ میں کوئی معنی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں عالم کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

''وہ تو جیسے میرے انتظار میں دن بھر بیٹھے ہی رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ کہیں کام ہی کرتے ہوں گے اور فیملی ساتھ نہیں ہے تو فلیٹ میں صرف رات ہی بتاتے ہوں گے......''۔

''تم نے تو ان کا پورا پروگرام ہی بتا دیا......''۔

عالم ہنسنے لگے۔ میں خفیف سی ہو گئی، پتہ نہیں کیوں۔

دو تین روز کے بعد شام کو دفتر سے واپسی پر عالم نے دروازے ہی سے پکارا۔

''ارے، دیکھو تو کون آیا ہے......''۔

میں دوڑی آئی اور دھک سے رہ گئی۔ عالم کے ساتھ......

''یہی ہیں نا تمہارے ماسٹر جی......؟''

عالم کے لہجے میں شوخی تھی۔ وہ شرمائے شرمائے سے مسکرا رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پا کر انہیں سلام کیا۔ چائے پر باتوں کا اتنا لمبا سلسلہ چلا کہ وقت ادب کر ہمارے پاس سے کافی دور چلا گیا۔ عالم نے کہا،

''اب آپ کھانا کھا کر جائیں گے......''۔

انہوں نے تھوڑا تکلف کرنے کی کوشش کی، لیکن عالم اتنے دبنگ ہیں کہ کسی بات کو ٹھان لیں تو پورا کر کے ہی دم لیتے ہیں۔

ان کا تبادلہ اسی شہر میں ہو گیا تھا۔ وہ بغل کے فلیٹ میں کرایہ دار کی حیثیت سے آئے تھے، شادی نہیں کی تھی اس لئے فلیٹ صرف ایک رین بسیرا ہی تھا۔ کھانا زیادہ تر باہر کھاتے، کبھی خود بھی پکا لیتے۔ ابھی اپنے فلیٹ کی چابی کھولتے ہوئے عالم کو نظر آ گئے تھے اور وہ ان سے اپنا تعارف کرا کے زبردستی لے آئے تھے۔

کھانے کے بعد وہ جانے لگے تو عالم نے نہایت اپنائیت سے انہیں حکم دیا کہ جب بھی انہیں کوئی ضرورت ہو، وہ بلا تکلف یہاں چلے آئیں۔ آخر کو یہ ان کی ایک شاگردہ کا گھر ہے۔ کھانے، ناشتے کے وقت موجود ہوں تو خود پکانے کی زحمت ہرگز نہ اٹھائیں۔ وہ مسکراتے ہوئے سنتے رہے، بولے کچھ نہیں گویا سر تسلیم خم تھا۔ تجدید ملاقات کا پہلا مرحلہ خیریت سے گزر گیا۔

لیکن یہ مرحلہ رسمیات میں پھنس گیا۔ کئی روز تک نہ وہ آئے نہ عالم کو ان کی یاد آئی۔ عالم بہت مصروف بھی رہے، لیکن میری فرصت کے سارے لمحوں میں وہ مسلسل چھائے رہے، یوں مجھے ان کا انتظار کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، کنوارے پن میں تو بہت سے لوگ خواہ مخواہ اچھے لگتے ہیں۔ فلم کی چلتی ہوئی ریل کی طرح صورتیں نظر آتی ہیں اور پھر تیزی کے ساتھ آگے بڑھ جاتی ہیں۔ ایک صورت کے بعد دوسری صورت...... یہ سلسلہ اُسی وقت تھمتا ہے جب......

ہاں ان کے ساتھ اتنی خصوصیت ضرور تھی کہ میں ان کے ایک موہوم اور بظاہر محسوس نہ ہونے والے لمس سے واقف تھی۔ یہ لمس میری زندگی میں جھانک کر بہت دور چلا گیا تھا اور کبھی کبھی اس کی ایسی کمی محسوس ہوتی کہ اس وقت کوئی دوسری چیز اس کی بھرپائی کر نہیں پاتی تھی۔

دوسری بار بھی عالم ہی انہیں پکڑ کر لائے۔

''لو، بھائی میں نے سوچا تھا آپ دونوں پہلے سے واقف ہیں تو تکلف کی دیوار توڑ کر ملتے رہیں گے لیکن آپ تو اجنبی کے اجنبی بنے رہے...... کیوں ڈارلنگ، تم ہی نے کبھی پہل کیا ہوتا......؟''

عالم نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ عالم کبھی کبھی نہیں سوچتے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ بھلا میں کسی اجنبی مرد کے تنہا گھر میں کیوں جھانکنے لگی......؟ لیکن میں جانتی تھی کہ کچھ بولوں گی تو خواہ مخواہ بحث کرنے لگیں گے اور ایک غیر مرد کے سامنے ان سے الجھنا مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔

اس دن وہ کافی کھل گئے۔ تاش بھی نکلا، کیرم بھی کھیلا گیا، حالانکہ کچن میں بار بار دوڑنے کے سبب میں ان کا زیادہ ساتھ نہیں دے سکی۔ کچھ ذاتی باتیں بھی ہوئیں۔ ابھی تک شادی نہیں کرنے کی ان کے پاس کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ اپنی موجودہ نوکری سے وہ مطمئن نہیں تھے اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں کئی نوکریاں چھوڑ چکے تھے وغیرہ وغیرہ۔

میرے بچوں کی باتیں بھی نکلیں جو مسوری کے ایک بورڈنگ اسکول میں تھے۔

میں نے ان کی پسند کا کھانا بنایا تھا، تہری، پنیر کا قورمہ، پودینے کی چٹنی اور رائتہ...... کھانا دیکھ کر ایک جانا پہچانا سا رنگ ان کے چہرے پر آیا اور میری طرف نگاہیں اٹھ گئیں جن میں کوئی معنی خیزی تو نہیں تھی لیکن کچھ خاص بات تھی جو مجھے میرے اندر اُترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کھانا انہوں نے اشتیاق کے ساتھ کھایا اور محاورتاً نہیں حقیقتاً اپنی انگلیاں چاٹ کر ہی اٹھے۔

عالم کا ان کے ساتھ بے حد دوستانہ اور اپنائیت سے بھرا ہوا رویہ تھا۔ دونوں تقریباً ہم عمر ہی تھے۔ اس دفعہ عالم نے ان سے پکا وعدہ لیا کہ اب وہ اس کا ہرگز انتظار نہیں کریں گے کہ پھر عالم ہی انہیں گھسیٹ لائیں اور دوسرے ہی دن انہوں نے اپنا وعدہ پورا بھی کر دکھایا۔ تقریباً گیارہ بجے گھنٹی بجنے پر میں نے کی ہول سے جھانکا تو انہیں دیکھ کر بوکھلا گئی۔ اس وقت گھر پر کوئی نہیں تھا۔ کام کرنے والی ماما جا چکی تھی۔ دروازہ کھولنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

''اندر آسکتا ہوں......؟''

ان کے ہونٹوں پر مخصوص مسکراہٹ رینگی۔

''ہاں...... ہاں، آیئے نا......''۔

میں نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ وہ اندر آگئے اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے

ایک جھجک کے ساتھ گویا ہوئے۔

''آج میرا دفتر بند ہے، میں گھر ہی پر تھا، سوچا عالم صاحب سے کیا ہوا وعدہ آج پورا کر ہی دوں''۔

''جی...... بہت اچھا کیا آپ نے...... پہلے یہ بتائیے آپ ٹھنڈا لیں گے یا گرم......؟''

میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ وہ میرے لئے یوں بھی کوئی اجنبی نہیں تھے۔ وہ مسکرائے۔

''آپ تو جانتی ہیں، مجھے ٹھنڈا سے زیادہ شوق نہیں اور چائے بنانے میں آپ کو زحمت بھی ہوگی اور دیر بھی......''۔

''نہیں...... نہیں، بس ایک آدھ منٹ لگے گا، اب میں پہلے جیسی دیر نہیں کرتی......''۔

میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ اتنی دیر میں، میرے اندر اعتماد بحال ہو چکا تھا۔ جواب کا انتظار کئے بغیر میں کچن کی طرف دوڑ گئی۔ چائے فوراً بن گئی۔ میں نے کپ ان کی طرف بڑھایا، اب پتہ نہیں کیسے ہوا، کیا ہوا کہ میری انگلیاں ان کے ہاتھ سے مَس ہو گئیں۔ ایک جانی بوجھی سی سہرن میرے پورے بدن میں دوڑ گئی اور میرا ہاتھ کانپ گیا۔ اگر وہ فوراً کپ تھام نہیں لیتے تو شاید چائے گر ہی جاتی۔ لیکن اس وقت ان کے سامنے میرا انجان اور بے نیاز بن جانا بہت ضروری تھا، سو میں نے یہی کیا۔ ذہن ودماغ سائیں سائیں کر رہے تھے، دل بری طرح دھڑک رہا تھا پھر بھی میں بے نیازانہ ان کی باتیں سنتی بھی رہی، اپنی کہتی بھی رہی۔ انہوں نے کچھ تازہ ادبی رسالے طلب کئے، میرے ذوق سے وہ واقف تھے۔ میں نے کچھ رسالے لا کر دیے، وہ انہیں لے کر اور شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور بدحواس سی صوفے پر گر پڑی۔ شکر ہے کہ گھر میں اس وقت کوئی نہیں تھا ورنہ میری حالت ہرگز چھپ نہیں سکتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس لمس کو مطاع گم شدہ سمجھ کر مجھے لطف اندوز ہونا چاہئے یا اپنے اندر شرمندگی کے احساس کو بڑھاوا دینا چاہئے۔ عالم کی بے پناہ چاہت سے میں سرشار تھی۔ میرے جسم کا پور پور ان کی بھرپور محبت سے شرابور تھا اور اس کے انگ انگ پر ان کے بوسوں کا لمس ثبت تھا لیکن یہ لمس...... یہ سوچتے ہوئے بھی مجھے ایک عجیب احساس گناہ ہو رہا تھا کہ یہ ادھورا، اچٹتا ہوا سا، اس سے بالکل مختلف تھا جو عالم کی محبت کے دباؤ کے زیر اثر احساس

پذیر ہوتا تھا...... یہ لمس اگر مکمل ہوتا تو......؟

میں پانی میں ڈوب بھی رہی تھی اور پانی سے نکلنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اس دن عالم کچھ سویرے نہ آجاتے تو نہ جانے میرا کیا حال ہوتا۔ عالم کا پہلے آجانا کچھ نیا نہیں تھا، دفتر میں کوئی خاص کام نہ ہوتا تو وہ سیدھے گھر ہی کا رُخ کرتے۔ میں نے انہیں چائے دیتے ہوئے گویا یونہی اطلاع دی۔

''آج وہ آئے تھے......''۔

''اچھا...... آج ان کا تکلف ٹوٹ گیا، چلو اچھا ہوا، اب تمہارا جی کچھ بہلا رہے گا......''۔

عالم نے خوش دلی سے کہا۔ میں نے قدرے سختی سے جواب دیا۔

''یہ آپ پر میری تنہائی کیوں سوار ہو گئی ہے......؟ ارے بھائی، مجھے فرصت نہیں ہے کسی سے فضول باتیں کرنے کی۔ انہوں نے کچھ لٹریری میگزین مانگے، میں نے دے دیئے......''۔

''ارے، ارے، تم اتناری ایکٹ کیوں کر گئیں......؟ میں نے سوچا، تمہارے ٹیوٹر رہ چکے ہیں، تم انہیں اچھی طرح جانتی ہو، پڑوس میں جان پہچان کا ایک آدمی رہے تو مجھے بھی تشفی رہے گی نا......''۔

عالم کا لہجہ خلوص سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے اپنے سخت لہجے پر ندامت سی ہوئی۔ میں نے بات بنائی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تنہائی میرا پرابلم نہیں ہے عالم، اس لئے آپ اس کی فکر مت کیجئے......''۔

تیسرے دن عالم کو رخصت کر کے ابھی میں پلٹی ہی تھی کہ گھنٹی بج اُٹھی۔ مجھے کوفت سی ہوئی، ابھی گھر کے سارے کام پڑے تھے، اس وقت بے موقع کون نازل ہو گیا۔ بادل ناخواستہ میں نے دروازہ کھولا تو وہی کھڑے تھے۔

''معاف کیجئے گا مسز عالم، آپ کو بے موقع تکلیف دی۔ دراصل میں دو تین روز کے لئے باہر جا رہا ہوں، سوچا، آپ کے میگزین آپ کو واپس کر دوں......''۔

''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن آپ اندر تو آیئے......''۔

میں نے بے حد اعتماد کے ساتھ کہا۔

''نہیں، میں ذرا جلدی میں ہوں، آپ یہ میگزین......''۔

انہوں نے رسالے میری طرف بڑھا دیے۔ اب پتہ نہیں میری لغزش تھی یا ان کی کہ میرا ہاتھ ان کے ہاتھ سے پھر ٹکرا سا گیا۔ ایک لطیف سی سہرن پھر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی اور جب تک میں اس پر قابو پاؤں، وہ جا چکے تھے۔ ان کی دُور جاتی ہوئی پیٹھ میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ میں نے دھڑام سے دروازہ بند کیا، رسالوں کو میز پر پھینکا اور صوفے پر گر کر سوچنے لگی کہ اس وقت مجھے اپنے ساتھ کون سا رویّہ اختیار کرنا چاہیے......؟

میں چہار دیواری میں قید کوئی عورت تو تھی نہیں، کسی نہ کسی کام سے مجھے باہر نکلنا ہی پڑتا تھا اور آٹو رکشہ، بس وغیرہ کا سہارا لینا ہی پڑتا تھا۔ اس لئے درجنوں اجنبی مردوں کے جسموں کا لمس میری مجبوری تھی، آٹو شیئر کرتے وقت کبھی کبھی تو اس قدر دھنس کر بیٹھنا پڑتا کہ بے بسی اور شرمندگی سے سچ مچ آنسو نکل پڑتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ گھر پہنچ کر میں نے کپڑوں کو اُتار نہیں پھینکا ہو اور خوب مل مل کر غسل نہ کیا ہو۔ کوفت اور گندگی کے موہوم احساس کو اس طرح کم ضرور کر ڈالتی تھی لیکن یہ لمس......

یہ لمس تو پتہ نہیں مجھے کن جہانوں کی سیر کراتا تھا۔ اس آدھے ادھورے لمس، بلکہ لمس سے زیادہ اس کے احساس نے عالم کے بھرپور اور گرم جوش لمس کی شدت کو کم کر دیا تھا اور مجھے دس بارہ سال قبل کے اس دور میں کھینچ کھینچ کر پہنچا دیا تھا جب ہوا کا ایک جھونکا بھی پورے جسم میں سہرن پیدا کر دیتا تھا اور لمس کے موہوم تصوّر سے بھی گدگدیاں سی ہونے لگتی تھیں۔

میں بہت دیر تک ایک عجیب عالم میں پڑی رہی۔ بار بار اپنے ہاتھ کو دیکھتی تھی، جیسے اس پر کوئی نشان سا پڑ گیا ہو، حالانکہ یہ میرا واہمہ تھا۔ کوئی نشان وشان نہیں تھا۔ دیکھتے دیکھتے اچانک محسوس ہوا کہ میرے ہاتھ اب ایسے نہیں رہے کہ ان پر کسی لمس کی تھرکن محسوس ہو، ہو سکتا ہے کبھی ایسے رہے ہوں، اب تو خاصے کھردرے ہو گئے ہیں اور دیکھنے میں بھی دلکش نہیں رہے۔ مجھے اپنے آپ پر شرم آنے لگی کہ ان ہاتھوں کے لمس کو میں نے کون سا درجہ دے رکھا ہے۔ ان بچارے کو خبر بھی نہیں کہ ان کے ایک انجانے، ادھورے لمس سے میں نے کن دنیاؤں کی تخلیق کر رکھی ہے......

بالکل یک طرفہ، یعنی خوش ہونے کے لئے میں نے احمقوں کی ایک جنت بنالی ہے......

میں فیصلہ کر کے اٹھی کہ میں خود کو اس خرافات سے باہر نکالنے کی کوشش کروں گی اور ہوش کے ناخن لوں گی......اس فیصلے سے میں کافی حد تک پر سکون ہوئی اور گھر کے فرائض کو بخوبی انجام

دے سکی۔

عالم کو میں نے پھر ان کے آنے کی اطلاع دی۔ انہوں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی اور ''اچھا'' کہہ کر اپنے روزمرّہ کے معمولات میں مشغول ہو گئے۔ ان کے اس رویّے سے مجھے خاصی کوفت ہوئی، کچھ تو بولتے، کچھ تو پوچھتے ......؟ ویسے اس میں کچھ بولنے یا پوچھنے کی بات تھی بھی نہیں۔ عالم کو تو یہی خوشی تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں میری بوریت کچھ کم ہو رہی ہوگی۔ اب ان کو پتہ ہی نہیں کہ مجھے تو بور ہونے کی بھی فرصت نہیں، بلکہ یہ جو میرے اندر احساسات کی دنیائیں جنم لیتی ہیں، یہ مجھے زیادہ پریشان کر رہی ہیں۔ لیکن فی الحال میرا خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔ زیادہ کھلنے سے میرے اندر کی کیفیت بھی ظاہر ہو سکتی تھی۔

میں ان دنیاؤں کو بھلانے میں مصروف ہو گئی۔

اس دن ایک ضروری کام سے مجھے بازار جانا پڑ گیا۔ میں عالم کے ساتھ بھی جا سکتی تھی لیکن وہ سویرے نکل جاتے تھے، اس وقت بازار نہیں کھلتے۔ میں نیچے سڑک پر آ کر آٹو کے انتظار میں کھڑی ہو گئی۔ فوراً ہی ایک آٹو میرے پاس آ کر رکی۔ کنارے کی آخری اور تیسری سیٹ خالی تھی۔ میں جلدی سے بیٹھ گئی۔ اب جو بقیہ مسافروں پر نگاہ ڈالی تو...... میرے بغل میں یعنی درمیانی سیٹ پر یہی بیٹھے تھے۔ میں بے حد خفیف ہوئی اور کسمسا کر رہ گئی۔ پہلے دیکھ لیتی تو شاید ہرگز نہ بیٹھتی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر پریشانی میں پڑ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی لیکن مسکراہٹ ہونٹوں پر کھل نہیں سکی۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے بدن کو چرانے اور ایک دوسرے سے بچانے کی کوشش کی تھی لیکن بے سود، اتفاق یہ کہ آٹو کے تینوں مسافر صحت مند تھے، میں کچھ زیادہ ہی فربہ تھی، میری جانگھیں، کمر اور کولہا ان کے جسم سے یوں سٹے ہوئے تھے کہ درمیان میں ہوا کے گزرنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ اس سچویشن کے بارے میں تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ابھی تک تو میں ایک ادھورے، موہوم سے لمس ہی کی بنیاد پر ایک تصوراتی دنیا کے تانے بانے بن بیٹھی تھی اور یہاں معاملہ یہ آن پڑا تھا کہ......

انہوں نے دو ایک بار رسمی باتیں کرنے کی کوشش بھی کی لیکن مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ بس اتنا یاد ہے کہ میں نے ہوں ہاں میں جواب دیا تھا۔ ایک عجیب سنسنی میرے پورے جسم میں دوڑ رہی تھی۔ اس سے بالکل مختلف جس کا تجربہ مجھے بہت چھوٹے پیمانے پر قبل ہو چکا تھا۔ شروع میں

مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا، اس کی شدت میں کمی آتی گئی اور میں ایک بار پھر لذت کے احساس کی جھاگ میں ڈوبتی گئی۔ آٹو تیز رفتاری سے بھاگا جا رہا تھا، بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا لیکن اندر اندر تبدیلی آ چکی تھی۔ میں نے کنکھیوں سے انہیں دیکھا۔ وہ دوسری طرف دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی ہماری نگاہیں ڈرائیور کے سامنے لگے آئینے میں ٹکرا جاتیں لیکن اسے محض اتفاق...... سمجھ کر نہیں، بلکہ دانستہ ہم اپنی نگاہیں فوراً ہٹا لیتے۔

ان کی منزل پہلے آ گئی۔ دوسری طرف کا مسافر بھی اتر گیا تو وہ اترے اور ایک جھجک کے ساتھ اپنے ساتھ میرا کرایہ دینے کی بات کہی۔ میں نے سختی سے منع کر دیا۔ آٹو والے نے بقیہ پیسے انہیں واپس کر دیے اور آٹو پھر چل پڑا۔

ان کے اترنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں لذت کے جھاگ سے باہر نکل آئی ہوں۔ میرے پورے جسم میں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ وہ نہیں تھے لیکن ان کا بھرپور لمس میرے احساسات پر چھایا ہوا تھا۔ اسی عالم میں، میں نے بازار میں ضروری کام انجام دیے، پھر آٹو کر کے گھر واپس آ گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسی میں گئی تھی ویسی واپس نہیں آئی، لیکن کیسی......؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی اور بہت کوششوں کے بعد بھی کسی نتیجے پر پہنچنے سے کوسوں دور تھی۔ صرف تبدیلی کا ایک احساس اُجاگر تھا لیکن کون سی تبدیلی......؟

بہت سارے خیالات ذہن میں گڈمڈ ہو رہے تھے، جسم بھی ان کے اثرات سے مبّرا نہیں تھا، لیکن ایک چیز کا اعتراف نہ کرنا خود اپنے ساتھ بے انصافی ہوگی کہ میرے اندر جو بہت سی لہریں چل رہی تھیں، ان میں انبساط کی لہر بھی تھی۔ ان سے میرا کوئی جذباتی تعلق نہیں تھا لیکن ان کی قربت نے مجھے اس وقت سرور عطا کیا تھا جب میں اس چیز سے واقف بھی نہیں تھی اور اب اسی گمشدہ سرور نے میرے اندر ایسا گھر کر لیا تھا کہ فرار کی میری ساری کوششیں ناکام ہو رہی تھیں۔

کیا میں بہت کمزور تھی......؟

کیا کمزوری میری فطرت کا ایک حصہ تھی......؟

مجھے یہ سوچ کر عجیب سا لگتا کہ کہیں میں ان کے انجانے پن سے فائدہ تو نہیں اٹھا رہی......؟ ان بچارے کو کیا پتہ کہ ان کے لمس نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ابھی تک اس لمس سے مجھے جو بھی سرور حاصل ہوا تھا، اس میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ میں نے بھی جان بوجھ کر لمس

کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دل کے کسی نامعلوم گوشے میں اس کی خواہش ضرور ہمکتی تھی اور میں اس کی طرف لپکتی تھی جب کہ وہ...... ان کے بارے میں مجھے کچھ پتہ نہیں۔

میں نے عالم سے قصداً اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ یوں بھی وہ ان چیزوں کو بہت ہلکے پن سے لے رہے تھے اور میں بار بار ان کی بات نکال کر اپنے آپ کو عالم کے سامنے ہلکا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میرے دل میں ایک چور سا بیٹھا تھا جو مجھے بار بار کچوکے دیتا رہتا کہ کہیں میں عالم سے بے وفائی کی مرتکب تو نہیں ہو رہی...... ؟ عالم سے ذکر نہیں کرنے میں، میری کوئی بدنیتی شامل نہیں تھی، میں تو برابر آٹو اور بس سے سفر کرتی تھی، پھر اس واقعہ کو خصوصیت سے بیان کرنے کی کیا تک تھی۔ کوئی اور مرد میرے ساتھ نہ بیٹھا، یہ بیٹھ گئے۔ وہ بھی جان بوجھ کر نہیں۔ عالم سے ذکر کرنے سے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خواہ مخواہ شک کی بو سونگھنے لگتے۔ وہ میرے جسم کے ان احساسات تک پہنچنے کی کوشش بھی کر سکتے تھے جو اس واقعہ کے نتیجے میں جاگزیں ہوئے تھے۔ بہتر تھا اسے بھول ہی جانا، ویسے میں کسی طرح بھلا بھی دیتی تو میرا جسم کیسے بھول جاتا۔

اس دوران وہ نظر بھی نہیں آئے۔ ہوسکتا ہے یہاں موجود نہ ہوں یا ممکن ہے وہ بھی سامنا کرنے سے پرہیز کر رہے ہوں۔ میں نے بھی کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ اچھا ہی ہے کچھ دن اسی طرح دوری برقرار رہے گی تو میرے جسم میں دوڑ رہی لہریں بھی کم ہو جائیں گی۔

تیل کا دام بڑھ جانے کے سبب آٹو اور دوسری پرائیویٹ سواریوں نے اچانک اسٹرائک کر دیا، آمد و رفت کا سارا زور سرکاری بسوں پر پڑ گیا۔ ان میں وہ دھکم پیل مچی کہ خدا کی پناہ، چھتوں اور سیڑھیوں پر بھی مسافر اَٹے پڑے تھے۔ میرا بازار جانا ضروری تھا، سو مجبوراً میں نے بس ہی کا سہارا لیا۔ کسی طرح اس میں چڑھنے کی جگہ مل گئی اور دھکا کھاتی ہوئی منزل پر پہنچی، وہاں سے واپسی پر بھیڑ اور بڑھ گئی تھی لیکن کرنا کیا تھا، ان لوگوں کی یہی مہربانی کیا کم تھی کہ تل بھر جگہ نہ ہوتے ہوئے بھی عورت کو دیکھ کر بس روک لیتے اور پھر عورت ہی ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی طرح کھڑا ہونے کی جگہ بھی مل ہی جاتی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میری کمر اور اس کے نچلے حصے پر کچھ دباؤ سا پڑ رہا ہے۔ دھکا کھانے اور جسم سے جسم سٹے رہنے کی تو میں عادی تھی لیکن دباؤ کا تجربہ کبھی کبھی ہوتا تھا اور انتہائی مجبوری میں اسے برداشت کرنا پڑتا تھا، لیکن یہ دباؤ تو غیر معمولی تھا۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھنے

کی کوشش کی۔ میں لرز کر رہ گئی، میری پشت پر وہی تھے...... بالکل وہی...... ان کی نگاہیں دوسری طرف تھیں۔ میں کسمسائی، لیکن وہاں اس کی بھی گنجائش کہاں تھی بلکہ اس عمل سے دباؤ کچھ بڑھ ہی گیا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ہوسکتا ہے، انہوں نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ زبردست بھیڑ اور دھکم پیل میں کون کس کو دیکھتا ہے۔ اتفاق سے میں اس جگہ پر تھی، دوسری عورت بھی ہوسکتی تھی۔ بہت سی عورتیں اس طرح بے ترتیب، بے حال کھڑی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس دفعہ ہماری نگاہیں ٹکرا گئیں۔ ان کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں جانی پہچانی سی چمک......

میں نے جلدی سے اپنی نگاہیں ہٹا لیں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگا جیسے میری عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ میں چیخ سکتی تھی، لوگوں کو رو رو کر اپنی بپتا سنا سکتی تھی لیکن جانتی تھی کہ اس طرح تماشا میں ہی بن جاؤں گی۔ اس بھیڑ میں بہت ساری عورتیں اسی عالم میں کھڑی تھیں۔ یہ تو خیر میری پہچان کے بندے تھے۔ ان کی جگہ کوئی دوسرا بھی ہوسکتا تھا، اس کا بھی یہی رویہ رہتا تو میں کیا کر لیتی......؟

لیکن دباؤ......

یہ وہ شخص تھا جس کے آدھے ادھورے لمس سے میں حظ اٹھاتی رہی تھی۔ اس کے اُچٹتے ہوئے قربانی لمحات نے مجھے لطیف ہیجان میں مبتلا کیا تھا۔ مگر وہ کس قدر معصوم تھا، شاید اسے خبر بھی نہیں تھی کہ اس کی قربت نے میرے اندر کون سا طوفان برپا کیا تھا، بالکل انجان تھا وہ، لیکن آج......

آج وہی شخص کس اطمینان سے میری پشت پر کھڑا ہے، اسے بھیڑ اور دھکم پیل کی ذرا پروا نہیں۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ، بوکھلاہٹ اور پشیمانی کے دور دور تک اثرات دکھائی نہیں دیتے۔ وہ چاہتا تو مجھ سے الگ تھلگ بھی کھڑا رہ سکتا تھا لیکن میری کمر پر اس کا دباؤ اس کے اندر کے سارے راز افشا کر رہا ہے۔ وہ، وہ نہیں ہے جو تھا، میں نے اس کی جو تصویر بنائی تھی وہ غلط ثابت ہوئی۔ آج اور ابھی وہ جو نظر آ رہا ہے، وہی صحیح ہے۔

میری منزل آگئی تو میں ان سے کچھ کہے بغیر چپ چاپ اُتر گئی۔ میں نے ان کی قربت سے حظ نہیں، کوفت اٹھائی تھی۔ اس کوفت نے میری سوچ کی دھار ہی تبدیل کر دی۔ میں اپنے

آپ سے شرمندہ تھی۔

دو تین روز کے بعد دروازے کی گھنٹی اچانک بج اٹھی۔ میں نے کی ہول سے جھانکا وہی تھے۔ میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ گھنٹی پھر بجی۔

میں نے پھر دروازہ نہیں کھولا۔

گھنٹی بجتی چلی گئی۔

میں چپ چاپ بیٹھی رہی۔ تھک ہار کر گھنٹی بند ہوگئی۔

پھر نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں ایک دم صوفے پر گر پڑی اور پھپک پھپک کر رونے لگی...... روتی رہی......۔

✠ • ✠ • ✠

بن موسم برسات

ٹرین کی رفتار وہی ہے جو تھی لیکن انہیں محسوس ہو رہا ہے کہ ٹرین چل نہیں رہی، رینگ رہی ہے۔ نہ صرف چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر اس کا رکنا لازمی ہے بلکہ بہت سے چھوٹے چھوٹے ہالٹ بھی بن گئے ہیں جہاں اس کا ٹھہرنا ضروری ہے۔ یوں رکتی تو وہ ایک آدھ منٹ کے لئے ہے، مگر پانچ، دس، پندرہ منٹوں تک رکے رہنا اس کے معمول میں شامل ہے۔ اس لائن پر سفر کرنے والے ایک خاص قسم کے فن سے بھی واقف ہیں۔ پائپ کھینچ کر چلتی گاڑی کو روک لینے کا فن۔ کوئی اجنبی دیکھ کر حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ پائپ نکالنے والا اپنے گھر کھانا کھانے، راستے میں پڑنے والے تاڑی خانے میں تاڑی پینے، ریلوے لائن کے ٹھیک سامنے آجانے والے مکان سے کسی دوست یا رشتہ دار کو Pick-up کرنے کے مقصد سے پائپ لئے بھاگا جاتا ہے، گارڈ اور ریلوے کے دوسرے ارکان اس کے پیچھے پیچھے اس کی خوشامد کرتے ہوئے دوڑتے جاتے ہیں، موڈ ہوا تو اس نے دے دیا ورنہ جب تک وہ نہیں دے گا، پائپ کے بغیر گاڑی نہیں چلے گی۔

''بوا، یہ گاڑی کب پہنچے گی......؟''

اٹھارہ انیس سال کی لڑکی ریل گاڑی کے بیل گاڑی بن جانے سے بے حد اکتا گئی ہے۔ وہ چھینٹ کا شلوار، جمپر پہنے ہوئے ہے۔ دوپٹے کو اس نے خاص احتیاط سے اپنے سینے کے گرد لپیٹ رکھا ہے، لیکن غریب کی جوانی یوں چھپتی ہے بھلا؟

''بس تھوڑی دیر اور۔ اس کم بخت گاڑی نے چار گھنٹے کا سفر دس گھنٹوں میں بدل دیا، یہاں کے لوگ چاہتے ہی نہیں کہ......''

چالیس بیالیس برس کی عورت اسے دلاسا دیتی ہے۔ غربت اس کے کپڑوں سے بھی عیاں

ہے۔اس نے بھی چادر کو سلیقے سے اپنے گرد لپیٹ رکھا ہے، افلاس کے باوجود اس کی صحت قابل رشک ہے، لڑکی اسے بوا ضرور کہہ رہی ہے لیکن دیکھنے میں وہ اس کی بڑی بہن سے زیادہ نہیں لگتی۔

لڑکی کھڑکی کی طرف سر کر لیتی ہے۔ باہر بھاگتے ہوئے نظارے اسے اچھے تو لگ رہے ہیں لیکن اتنی دیر تک ایک ہی جیسے منظر کو کتنا دیکھا جائے......؟

دونوں زیادہ تر چپ ہی رہی ہیں۔ایک خاص قسم کی وحشت دونوں کے چہرے پر شروع سے چھائی ہوئی ہے۔ایسا لگتا ہے دونوں کے دل میں کوئی چور چھپا بیٹھا ہے۔ادھیڑ عورت کبھی کبھی لڑکی سے چائے پانی کے لئے پوچھتی ہے۔لڑکی زیادہ تر انکار ہی کرتی ہے۔عورت نے اپنے تھیلے سے کاغذ میں لپیٹی آلو کی روٹیاں اسے دیں تو بادلِ ناخواستہ اس نے لے تو لیں لیکن اتفاق یہ کہ پہلا ہی نوالہ اس کے حلق میں اٹک گیا، اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔یہ دیکھ کر عورت جلدی سے پیالا لے کر نیچے اترنے کو آگے بڑھتی ہے، لڑکی اس سے بھی زیادہ تیزی سے اٹھ کر نیچے اتر جاتی ہے اور سامنے لگے نل سے چلو بھر بھر کے پانی پیتی ہے۔نوالہ حلق کے نیچے چلا جاتا ہے۔اس کی جان میں جان آجاتی ہے۔وہ چہرے پر بھی پانی کے چھینٹے مارتی ہے۔اس کی آنکھوں اور گالوں پر آئے آنسو ڈھل جاتے ہیں۔عورت پیالہ پانی سے بھر کے اسے دیتی ہے۔

''لو اور پی لو...... ہزار بار کہا بنی، پانی سامنے رکھ کے کھایا کرو، تمہارے حلق میں تو نوالہ ہمیشہ اٹکتا ہے......''

''کیا کروں بوا...... آپ نے دے دیا تو میں نے کھا لیا۔

بھوک بالکل نہیں لگ رہی تھی......'' لڑکی بے چارگی کے انداز میں کہتی ہے۔پیالہ بھر پانی پی کر وہ اسے پھر بھر لیتی ہے اور احتیاط سے آہستہ آہستہ چل کر اپنی جگہ پر آ بیٹھتی ہے اور بقیہ روٹی کھانے لگتی ہے۔

ادھیڑ عورت پلیٹ فارم پر یوں ٹہل رہی ہے جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہو۔آس پاس کے لوگ اسے غور سے دیکھتے ہیں۔کچھ نگاہوں میں سوالیہ نشانات بھی چمکتے ہیں لیکن کھڑکی کے پاس بیٹھی لڑکی پر سب کی نگاہیں ضرور آکر ٹھہرتی ہیں۔

ٹرین دھیرے دھیرے رینگنے لگتی ہے۔

لڑکی گھبرا کر کھڑکی سے عورت کو آواز دیتی ہے۔

''بوا......بوا......ارے چڑھیں کہ نہیں......؟''

کچھ لوگ اسے سمجھاتے ہیں، بوا ضرور چڑھ گئی ہوں گی، ابھی تو ٹرین رینگ ہی رہی ہے لیکن لڑکی کا اضطراب کم نہیں ہوتا، اسی وقت عورت ہانپتی کانپتی، بھیڑ کو چیرتی سامنے آجاتی ہے۔ چہرے پر چھائی وحشت معدوم ہونے لگتی ہے۔ اگر چہ وہ مسکراتی نہیں ہے لیکن اس کا چہرہ مسکان بھرا ہو جاتا ہے۔

''موئی...... نہ وسل، نہ آواز، بس چپکے سے چل دی، وہ تو کہو ایک بیچارے نے ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچ لیا ورنہ......''۔

عورت ابھی تک ہانپ رہی ہے۔ لڑکی مطمئن سی ہو کر کھڑکی سے باہر کے بھاگتے مناظر دیکھنے میں محو ہو جاتی ہے۔ سارا ماحول اونگھنے لگتا ہے۔

''آپ کی لڑکی ہے......؟''

ایک دوسری ادھیڑ عمر عورت اچانک دریافت کرتی ہے۔ عورت سوال کے یکایک دھماکے سے چونک اٹھتی ہے، پھر دھیرے سے جواب دیتی ہے۔

''بھتیجی......''

''سسرال لے جا رہی ہیں کیا......؟''

وہ پھر سوال داغتی ہے۔ ادھیڑ عورت سٹپٹا سی جاتی ہے۔

''نہیں تو...... اس کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی......''

''معاف کرنا بہن...... پھر کسی رشتہ دار کے ہاں جا رہی ہوں گی......؟''

اس عورت کی پٹاری میں سوالوں کے ابھی کئی پٹاخے باقی ہیں۔

''ہاں...... ایک ضروری کام سے جا رہے ہیں......''

عورت گول مول سا جواب دینے کی کوشش کرتی ہے۔

''علاج کے لئے......؟''

اس نے اپنی پٹاری باقاعدہ کھول دی ہے۔

''ہوں......''

عورت یوں ہی سر ہلا دیتی ہے۔ اس پر باتونی عورت شہر کے کچھ قابل ڈاکٹروں کی ایک فہرست اسے زبانی سنا ڈالتی ہے۔ یہ بھی کہ کون ڈاکٹرز زنانہ امراض کے ماہر ہیں اور ان کی فیس کتنی ہے وغیرہ۔

لڑکی کا پارہ گرم ہو رہا ہے۔ لیکن عورت کا ایک خفیف مگر مضبوط اشارہ پا کے وہ چپ رہتی ہے۔ ادھیڑ عورت بظاہر باتونی عورت کی باتیں سن رہی ہے لیکن اس طرح چپ رہ کر وہ شاید اس کی پٹاری کو بند کرنا چاہتی ہے۔ عورت ایک وقفے کے لئے جیسے ہی رکتی ہے ایک مونگ پھلی والا آواز لگاتا ہوا وہاں آ جاتا ہے۔ ادھیڑ عورت جلدی سے لڑکی سے پوچھتی ہے

''چنیا بادام کھاؤ گی بنی......؟''

''نہیں......''

لڑکی مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتی ہے۔ لیکن عورت لڑکی کی ''نہیں'' پر نہیں دھیان دے کر پچاس گرام مونگ پھلی لے لیتی ہے مگر مونگ پھلی والے سے پیسوں کے معاملے میں اس کی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔ وہ پچاس گرام کے دو روپے مانگ رہا ہے۔ عورت کہتی ہے کہ ایک روپے میں بھی اتنی مونگ پھلی مہنگی ہے۔ وہ اس کے بستے پر سے ایک دو پھلیاں کھول کر دکھا بھی دیتی ہے کہ وہ اندر سے کھوکھلی ہیں۔ باتونی عورت، اس کی مدد کو آ جاتی ہے، کچھ اور لوگ بھی......

مونگ پھلی والا کمزور سہی، لیکن اپنی دفاع میں ڈٹ جاتا ہے۔

''دے دو بوا...... کیوں خواہ مخواہ تماشا لگوا رہی ہو......؟''

لڑکی اس سچویشن سے پریشان ہو کر عورت کو دھیرے سے ٹھوکا لگاتی ہے۔ مونگ پھلی والا ایک مضبوط حمایتی پا کر شیر ہو جاتا ہے۔

''نہیں بیٹا...... یہ لوگ لوٹتے ہیں، بھلا یہ چار دانے چنیا بادام کے دو روپے......''

باتونی عورت لڑکی کو جواب دیتی ہے۔

''تو پھر چنیا بادام واپس کر دو، کیوں بے کار میں بحث کرتی ہو، اس کو نہیں پڑ رہا ہے تو نہیں دے رہا ہے......''

لڑکی چڑ کر ادھیڑ عورت سے کہتی ہے۔ اس پر مونگ پھلی والا کہتا ہے کہ وہ تولی ہوئی چیز واپس نہیں لے گا، اسے ہر حال میں پیسے چاہئیں۔ چار و نا چار ادھیڑ عورت اپنی ساڑی کے پلو سے بندھی ریزگاری نکال کر گنتی ہے۔ پھر پیسے مونگ پھلی والے کی طرف بڑھا کر کہتی ہے۔

''لے اپنے پیسے...... لیکن دس پیسے کم ہیں، میرے پاس ہیں ہی نہیں تو کہاں سے دوں......''

مونگ پھلی والا خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے ایک جھٹکے میں پیسے لے لیتا ہے

اور دو چار قدم آگے جا کر بڑبڑاتا ہے۔

''گانٹھ میں پیسے رہتے نہیں اور شوق ہے چنیا بادام کھانے کا، جانے کہاں سے یہ بھیک منگے چلے آتے ہیں......''

اس کا تبصرہ سب سنتے ہیں، پر کوئی کچھ نہیں کہتا۔

مونگ پھلی والا بڑبڑاتا ہوا دور نکل جاتا ہے۔ ادھیڑ عورت مونگ پھلی کا دونا لڑکی کی طرف بڑھاتی ہے۔

لڑکی انکار کر دیتی ہے لیکن عورت کے شدید اصرار پر دو ایک دانے اٹھا لیتی ہے۔

''آخر ہم کب پہنچیں گے بوا......؟''

لڑکی بے حد اکتا گئی ہے۔

''بس......اب آہی گیا......دو اسٹیشن اور......''

عورت اسے دلاسا دیتی ہے۔

''ابھی دو اسٹیشن اور......؟''

لڑکی کو دو اسٹیشن کا سن کر اور کوفت ہوتی ہے۔

''چھوٹے چھوٹے اسٹیشن ہیں......بہت جلدی طئے ہو جائیں گے......''

باتونی عورت بھی اسے تسلی دیتی ہے۔

''وہاں کوئی آئے گا بوا......؟''

لڑکی دھیرے سے ادھیڑ عورت سے پوچھتی ہے۔ عورت اس سے بھی زیادہ آہستہ سے جواب دیتی ہے۔

''ماموں......''

''اس کا تو وہ چاچا لگے گا نا......؟ تمہارا بھائی......؟''

باتونی عورت پھر ٹپک پڑتی ہے۔ ادھیڑ عورت چونک اٹھتی ہے۔ پتہ نہیں اتنی دھیمی بات اس نے کیسے سن لی......؟ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دے، لیکن اپنی حالت پر قابو پا کے وہ مسکراتی ہے۔

''ہاں......ٹھیک ہی تو ہے، اس کا تو وہ چاچا ہوا......اصل میں اپنے بچّوں کا خیال آ گیا،

یوں بھی بھتیجی بیٹی میں فرق کیا ہوتا ہے......"

لڑکی اس کو بہت ہی معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہے اور دل ہی دل میں اس کی ذہانت پر عش عش کر اٹھتی ہے۔

"فرق......؟ ارے بھتیجی کا خون تو بالکل اپنا خون ہوتا ہے......"

باتونی عورت، بہت سادگی سے کہتی ہے۔

گاڑی دھیرے ہونے لگی ہے، شاید کوئی اسٹیشن آ رہا ہے۔ ادھیڑ عورت پان سگریٹ بیچنے والے ایک لڑکے سے دریافت کرتی ہے تو وہ اسی اسٹیشن کا نام لیتا ہے جو ان کی منزل مقصود ہے۔ ادھیڑ عورت کے چہرے پر خوشی کی ننھی ننھی بوندیں چمک اٹھتی ہیں۔ وہ لرزتے ہوئے لہجے میں لڑکی سے کہتی ہے۔

"لو بنّی...... آ گئے......"

باتونی عورت کی منزل شاید آ گے ہے۔ اس کے چہرے پر ان لوگوں کا ساتھ جلدی چھوٹ جانے کا ملال آ جاتا ہے۔ ادھیڑ عورت اس کی طرف دیکھتی بھی نہیں بلکہ اترنے کی خوشی میں خواہ مخواہ مصروف نظر آنے لگتی ہے۔ اس نے اوپر رکھے دو تھیلے اتار کر نیچے رکھ لئے ہیں۔ گاڑی رک جاتی ہے اترنے چڑھنے والوں، قلیوں اور خوانچہ والوں کے شور شرابے سے کان پڑے آواز سنائی نہیں دیتی۔ لڑکی اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور جاتے ہوئے باتونی عورت سے کہتی ہے:

"اچھا خالہ...... چلتے ہیں، دیکھئے پھر کب ملاقات ہو......"

اتنی دیر میں ادھیڑ عورت دروازے کے پاس پہنچ کر لڑکی کو پکارتی ہے۔

"جلدی آ و بنّی...... اترنا نہیں ہے کیا......؟"

لڑکی جلدی سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ دونوں ایک ایک تھیلا سنبھالے پلیٹ فارم پر اترتی ہیں اور وہاں کھڑی ہو کر متلاشی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی ہیں۔ پختہ عمر کا ایک آدمی بوسیدہ پینٹ شرٹ پہنے دوڑا آتا ہے اور ادھیڑ عورت کو سلام کرتا ہے۔

"ارے چنو...... تم آ گئے......؟ میں تو بہت پریشان ہو گئی تھی...... شکر ہے تم دکھائی تو دیے......"

"کیسے نہیں آتا باجی......؟ آپ کے آنے کی جانکاری تو تھی ہی، بہت اچھا ہوا آپ آ گئیں اور یہ......؟"

''بنی......!''

عورت دھیرے سے بتاتی ہے۔

''ارے بنی......؟اتنی بڑی ہوگئی اور اتنی اچھی......؟''

وہ ایک گہری اور معنی خیز نگاہ لڑکی پر ڈالتا ہے، لڑکی اسے سلام کر کے تھوڑا سمٹ جاتی ہے۔اسی وقت ریل کے ڈبے سے آواز آتی ہے۔

''اچھا بہن......تمہارے بھائی آگئے نا......؟ خوش رہو......''

سب چونک اٹھتے ہیں۔باتونی عورت چلتی ہوئی گاڑی سے اپنا ہاتھ ہلاتی ہے۔ادھیڑ عورت بھی اپنا ہاتھ اٹھا دیتی ہے۔لڑکی اسے سلام بھی کرتی ہے۔گاڑی تیزی سے آگے نکل جاتی ہے۔

''یہ کون......؟''

چنو دھیرے سے پوچھتا ہے۔

''خدائی فوجدار......''

عورت زیر لب جواب دیتی ہے۔لڑکی کو اس کا یہ انداز اچھا نہیں لگتا، لیکن وہ خاموش رہتی ہے۔

چنو دونوں تھیلے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیتا ہے۔سب چل پڑتے ہیں۔

''باجی......آپ لوگوں کے ٹھہرنے کا بہت اچھا انتظام کیا ہے، آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی......''

''وہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن کام کے بارے میں سوچو بھیا......''

عورت مسکراتی ہوئی کہتی ہے۔

''کام......؟ کام تو باجی آپ کا وہ چاندی ہوگا کہ آپ نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا......آپ نے بھی تو جی خوش کر دیا ایک دم سے......''

چنو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہتا ہے......آخری جملہ بہت آہستہ سے......عورت اس کے بازو میں ہلکا ٹہوکا لگاتی ہے، پھر کچھ سوچ کر مسکرانے لگتی ہے۔لڑکی ان تمام باتوں سے بے نیاز ہے۔

باہر نکل کر چنو ایک چھوٹا ٹیمپو طے کرتا ہے۔درمیان میں لڑکی بیٹھتی ہے، چنو بڑی بے تکلفی سے اس میں دھنس جاتا ہے۔لڑکی بالکل سمٹ جاتی ہے، لمحوں کی اس کشمکش کو عورت سمجھ جاتی ہے

اور مسکرا کر کہتی ہے۔

''چاچا ہے نا بنّی...... اس سے کیا شرمانا، اسی کے بلانے پر تو ہم یہاں آئے ہیں۔ کام دلانے کا اسی نے وعدہ کیا ہے نا......''

لڑکی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرتا۔ چھّو بڑے جوش سے کہتا ہے:

''اور کام بھی ایسا باجی کہ ہماری بنّی راج کرے گی راج...... اس کے صدقے میں ہم بھی راج کریں گے......''

ٹیمپو والا اس کی شہہ پا کر جیسے ہوائی جہاز پر جا بیٹھتا ہے۔ اس کا ٹیمپو اڑا جا رہا ہے۔ چند ہی منٹوں کے بعد مختلف سڑکوں اور گلیوں سے گزر کر ٹیمپو ایک تین منزلہ عمارت کے پورٹیکو میں آ کر رکتا ہے۔

''یہ آپ کا گھر ہے......؟''

لڑکی اٹھتی ہوئی نگاہوں سے عمارت کو دیکھتی ہے۔ سامان نکالنے میں مصروف چھّو بہت زور سے ہنس پڑتا ہے۔

''میرا گھر......؟ اس میں آپ جیسے چاند تاروں کو رکھنے کی جگہ کہاں بنّی......؟ ارے یہ تو ہوٹل ہے......''

''ہوٹل......؟''

عورت اور لڑکی ایک ساتھ بول اٹھتی ہیں۔

''ہاں بھائی تو اور کیا......؟ میں تو صرف ایک کمرے میں رہتا ہوں، بیچلر ڈیرا ہے۔ وہاں آپ لوگوں کو کیسے ٹھہرا سکتا ہوں۔ بیت الخلا کے لئے بیس بیس آدمی نمبر لگاتے ہیں، ہر ایک کا نمبر وقت کے ساتھ بندھا ہوا ہے......''

چھّو پیسے ادا کر کے ٹیمپو والے کو رخصت کر دیتا ہے۔ ہوٹل کا ایک بیرا اندر سے آ کر ان کا سامان لے جاتا ہے۔ عورت سب کے ساتھ چلتی ہوئی سوچ رہی ہے کہ وہ ہوٹل کا کرایہ کہاں سے ادا کرے گی......؟ چھّو اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کس کسمپرسی کے عالم میں آئی ہیں...... چھّو تک شاید اس کی سوچ پہنچ جاتی ہے، وہ چپکے سے اس کے کان میں کہتا ہے۔

''فکر مت کیجئے گا باجی...... سب انتظام ہو جائے گا......''

لڑکی ان کی کھسر پھسر سن کر کوشش کرتی ہے کہ ان کی بات سنے لیکن اس کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ چتو کاؤنٹر کی کاروائی میں لگ جاتا ہے۔ وہ لوگ بیرے کے ساتھ فرسٹ فلور کے ایک کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ کمرہ کشادہ ہے۔ کھڑکی سے باہر کی تازہ اور ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔ بیچوں بیچ ایک بڑا سا پلنگ بچھا ہے، دو کرسیاں، ایک میز...... ان کے لئے نہ صرف بہت کافی ہے بلکہ شاید اتنے شان دار کمرے میں اس سے پہلے ان کا گزر بھی نہیں ہوا ہے۔ ان کے پاس اس وقت چار ایسی نگاہیں ہیں جن میں حیرت، خوشی، نااعتباری اور شاید...... ڈر کے عناصر شامل ہیں۔

ابھی وہ پورے طور پر گرد و پیش کو سمجھ بھی نہیں پاتی ہیں کہ چتو کمرے میں داخل ہوتا ہے اور ان کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے۔

''کمرہ پسند آیا باجی......؟ یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ جس چیز کی ضرورت ہو، گھنٹی دبا دینا، کھانے پینے کی جو خواہش ہو، مانگ لینا......'' عورت کے سارے احساسات تشکر کے جذبے میں ڈھل جاتے ہیں۔ لڑکی کی آنکھوں میں البتہ شک وشبہ کی ڈوریاں بھٹک رہی ہیں۔

''بھائی، تم تو یوں ہماری خاطر کر رہے ہو......''

عورت جان بوجھ کر خاموش ہو جاتی ہے۔ یوں بھی چتو کو بات کاٹنے کی عادت ہے۔

''کمال کرتی ہیں باجی...... آپ آخر ہماری مہمان ہیں، پھر بٹی پہلی بار یہاں آئی ہے......'' کہتے کہتے وہ گھنٹی دبا دیتا ہے۔ دور کہیں تیز گھنٹی کی آواز ابھرتی ہے۔ بیرا تیزی سے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ چتو اسے حکم دیتا ہے۔

جلدی چائے، ساتھ میں کچھ کھانے کو بھی......''

لڑکی غسل خانے میں چلی جاتی ہے۔ چتو چاروں طرف چوکنی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہتا ہے:

''قسم خدا کی باجی...... میں نہیں جانتا تھا کہ دیہاتوں میں ایسی چیزیں بھی...... اللہ کی، اس کو تو دیکھ کر وہ پاگل ہو جائیں گے، منھ مانگے دام دیں گے، منھ مانگے دام......'' عورت دھیرے سے جواب دیتی ہے۔

''اس سے میں نے کچھ نہیں کہا ہے، کام کے بہانے لائی ہوں، زیادہ ہنسنے بولنے والی لڑکی نہیں ہے، اپنے آپ میں کھوئی رہتی ہے، ویسے غریب بہت ہے......''

''غربت پر یہ حال ہے......''

چتو ہونٹ دبا کر ہنستا ہے۔

''کیا کرے بچاری...... پانی بھی پیتی ہے تو شہد بن کر لگتا ہے۔ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے......''۔

عورت کے انداز میں ہمدردی ہے۔

سچ مچ کا شہد کھائے گی تب کیا ہوگا...... ہنی مون......''

چتو ایک آنکھ دبا کر ہنستا ہے۔عورت اس کا ساتھ تو دیتی ہے لیکن مسکرانے کی حد تک۔ لڑکی غسل خانے سے نکل آتی ہے تب عورت غسل خانہ جانے کو اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

''بنّی تم جب تک چتو چاچا سے بات کرو، میں ابھی آئی......''

لڑکی آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوارتی ہے۔چتو کی موجودگی کے سبب وہ جھجک رہی ہے۔چتو بظاہر بے نیازی سے کھڑکی کے نیچے دیکھ رہا ہے لیکن اس کا دھیان لڑکی میں اٹکا ہوا ہے۔وہ کھڑکی ہی کی طرف منہ کئے ہوئے لڑکی سے مخاطب ہوتا ہے۔

''پہلی بار آئی ہو بنّی......؟''

''جی......''

لڑکی مختصر سا جواب دیتی ہے۔

''آج شام شہر گھومنے چلیں گے۔ بہت بڑا شہر ہے، سنیما ہال، پارک، چم چم کرتی سڑکیں، بڑے بڑے ہوٹل......اور بھی بہت سی چیزیں......''

لڑکی کے چہرے پر ایک ہلکا سرخ رنگ جھلکتا ہے، جسے وہ ایک خوبصورت ناکامی کے ساتھ چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔اس عالم میں اس کے ہونٹوں کے ایک گوشے سے ایک بہت ہی خفیف مسکراہٹ سی ابل پڑتی ہے۔عورت غسل خانے سے نکل آتی ہے اور اپنا جوڑا باندھتی ہوئی پوچھتی ہے۔

''کیا کیا باتیں ہوئیں چاچا بھتیجی میں......؟''

''کوئی خاص نہیں......تین چار دن ہم یہاں خوب گھومیں گے، بنّی پہلی بار یہاں آئی ہے نا، یہاں کی آب و ہوا ٹھیک سے دیکھ لے......''۔

چتو مسکراتے ہوئے بتاتا ہے۔عورت کچھ نہیں بولتی، وہ آئینے کے سامنے سے کنگھی کر کے ہٹتی ہے تو جیسے پورے کمرے میں سما جاتی ہے۔معمولی کپڑوں میں ملبوس وہ اس عمر میں بھی خاصی

جاذبِ نظر ہے۔ چنو کی نگاہیں اس پر ٹھہری جاتی ہیں۔ اِن نگاہوں میں توصیفی کلمات پوشیدہ ہیں۔

''اتنے پیسے کہاں خرچ کرو گے چنو...... ہمارے پاس تو بھائی اتنے پیسے نہیں کہ سیر سپاٹے میں خرچ کرتے پھریں......''

عورت اتنی دیر کے بعد بے چارگی سے کہتی ہے۔

''آپ بھی باجی...... میں نے کہا نا آپ میری مہمان ہیں، آپ یہ کیوں سوچتی ہیں کہ......''

چنو کے انداز میں مصنوعی ناراضگی ہے۔ اس ناراضگی میں اپنائیت کو حاوی پا کر عورت کہتی ہے:

''اچھا بھائی، جیسی تمہاری مرضی......''

چائے آ جاتی ہے، ساتھ میں مکھن لگے ٹوسٹ بھی۔ چنو ان سے کھانے کو کہتا ہے اور ایک ٹوسٹ خود اٹھا لیتا ہے۔ عورت ٹوسٹ یوں کھاتی ہے جیسے روٹی کھا رہی ہے، لیکن لڑکی نفاست سے دھیرے دھیرے اس کے کور کو علاحدہ کر کے کھاتی ہے۔

کھاپی کر وہ باہر نکلتے ہیں۔ چنو ایک رکشے کو آواز دیتا ہے۔ لڑکی کنکھیوں سے عورت کی طرف دیکھتی ہے...... ایک رکشا اور تین بندے......

رکشے پر چنو اور عورت بیٹھ جاتے ہیں۔ لڑکی کے لئے گود میں بیٹھنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، یا تو عورت کی گود میں بیٹھے یا چنو کی یا پھر دونوں کی...... وہ جھجکتی ہے، عورت اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہے۔

''آؤ نا بنّی...... ارے تمہارا چاچا ہے، اس سے کیا شرمانا......''

اپنے بدن کو بہت چراتے ہوئے وہ عورت کی گود میں بیٹھ جاتی ہے لیکن عورت کچھ یوں اپنا پہلو بدلتی ہے کہ وہ دونوں کی گود کے درمیان پھنس سی جاتی ہے۔

''کوئی بات نہیں بنّی آرام سے بیٹھو......''

چنو اس کی کمر کو تھپتھپاتا ہے، وہ چوری بیٹھی رہتی ہے۔

شہر کی سڑکیں، بہت صاف، ستھری، چکنی، چوڑی، رنگ برنگی، ہر سائز کی گاڑیاں، موٹر سائیکل، اسکوٹر، بسیں، پیدل چلنے والے، طرح طرح کی روشنیوں سے بھرپور دوکانیں، شیشوں

میں سجے سجائے، بالکل حقیقی نظر آنے والے مجسمے......

وہ دونوں آنکھیں پھاڑے سب کچھ دیکھتی ہیں۔ لڑکی تو اس قدر محو ہو چکی ہے کہ اس کی کمر، پیٹھ اور کاندھوں پر ان جانے دباؤ اور لمس کا اسے احساس باقی ہی نہیں رہا۔ ایک اوپن ایئر ریستوراں کے پاس چنو رکشا رکواتا ہے۔

''آؤ۔ یہاں کچھ دیر بیٹھتے ہیں......''

سب رکشے سے اتر کر صحن میں بچھی گارڈن چیئرس پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس ماحول میں بیٹھنے کا شاید ان عورتوں کا پہلا تجربہ ہے۔ انہیں بہت اچھا لگتا ہے۔ لگ بھگ سبھی کرسیاں بھری ہیں، کچھ لوگ ایک ساتھ بیٹھنے کے انتظار میں گروہوں میں کھڑے ہیں......

ہلکے پھلکے ناشتے، گلاس اور بوتلوں میں رنگین مشروب، چائے، کافی......

''کیا پینا ہے......؟''

چنو آگے جھک کر بنّی سے دریافت کرتا ہے۔ لڑکی عورت کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔

''کچھ بھی منگوا لو نا بھائی......''

عورت جواب دیتی ہے۔ چنو بیرے سے لمکا کی تین بوتلیں لانے کو کہتا ہے اور اٹھ کر اچانک کہیں چلا جاتا ہے۔ دونوں گھبرائی نظروں سے چاروں طرف دیکھتی ہیں۔ ماحول اچھا ضرور لگ رہا ہے لیکن ان کے لئے قطعی اجنبی ہے۔ چنو نے جاتے وقت ان سے کچھ کہا بھی نہیں۔

بیرا تین بوتلیں لا کر رکھ جاتا ہے۔ تینوں میں سفید نلکیاں پڑی ہیں۔ وہ چپ چاپ بوتلوں کو گھورتی رہتی ہیں۔

چنو کا کوئی پتہ نہیں۔

''کہاں چلے گئے......؟''

لڑکی دھیرے سے دریافت کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور اکتاہٹ کے سائے لرز رہے ہیں۔

''کچھ کہہ کر تو گئے نہیں......''

عورت اس سے زیادہ دھیرے سے جواب دیتی ہے۔ الجھن اس کے چہرے سے بھی عیاں ہے۔

''آپ کے سچ مچ کے بھائی ہیں......؟''

لڑکی پوچھتی ہے۔

''نہیں...... بالکل سگا تو نہیں، پر اپنوں سے بڑھ کر۔ سگا، بہت کام آتا ہے ہمارے، جو کہو، فوراً پورا کر دے گا۔

عورت مختصر الفاظ میں چتو کی تعریف کرتی ہے۔ اسی وقت چتو واپس آ جاتا ہے اور بوتلوں کو یوں ہی رکھا دیکھ کر کہتا ہے۔

''ارے، آپ لوگ اس کے گرم ہونے کا انتظار کر رہی ہیں؟ ٹھنڈے کو ٹھنڈا ہی پینا چاہئے نا؟

''ہم تو تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ کہاں چلے گئے تھے؟

عورت دریافت کرتی ہے۔ اسے دیکھ کر ان کی جان میں جان آ جاتی ہے۔

''ایک ضروری کام سے گیا تھا...... لیکن گھبرانے کی کیا بات تھی، میں تو فوراً واپس بھی آ گیا، لو لمکا پیو''۔

ایک بوتل وہ خود اٹھالیتا ہے۔ بوتل کی اندرونی اور خارجی دیواروں سے اس کے چہرے کی چمک صاف نظر آتی ہے۔ عورت بوتل اٹھا کر پائپ سے اوپر کھینچنے کی جگہ اسے پھونک دیتی ہے، مشروب اچھل کر باہر آ جاتا ہے اور اس کے منھ اور کپڑوں پر گر جاتا ہے۔ لڑکی بے ساختہ ہنس پڑتی ہے۔ عورت شرمساری ہو جاتی ہے، چتو رومال نکال کر اسے دیتا ہے۔

''کوئی بات نہیں...... اصل میں کولڈ ڈرنک کو پائپ سے اوپر کھینچنا چاہئے۔'' لڑکی اب بوتل اٹھاتی ہے۔ اس کا بھی پہلا تجربہ ہے لیکن وہ عورت کے تجربے سے کچھ سیکھ چکی ہے اس لئے پوری مہارت سے دھیرے دھیرے مشروب کو اوپر کھینچتی ہے۔ عورت رومال سے اپنے چہرہ اور کپڑے صاف کرتی ہے۔ چتو اس کی بوتل کا باقی مشروب گلاس میں انڈیل کر اسے تھما دیتا ہے۔

کولڈ ڈرنک سے فارغ ہو کر چتو کی سرکردگی میں وہ "Sight Seeing" کے لئے چل پڑتی ہیں۔ رات بھیگ چلی ہے۔ شہر کی روشنیوں سے اس کے رشتے کا اسرار بڑھ گیا ہے۔ کچھ لوگوں کو رات اور روشنیوں کے کھیل میں بہت مزا آتا ہے۔ شہر کی سڑکوں پر روشنیاں رات کو یوں دوڑاتی ہیں کہ اسے تاریک گلیوں اور بدنصیب ویرانوں میں ہی منھ چھپاتے بنتا ہے۔

ایک دو گھنٹے رکشے پر یوں ہی گھومتے رہنے کے بعد چنو ایک ڈھابے کے پاس رکشا رکواتا ہے۔

''کھانا کھالیتے ہیں باجی...... ہوٹل میں بھی کھا سکتے ہیں، لیکن یہاں کا کھانا بہت اچھا ہوتا ہے......''

انہیں کیا پتہ کہاں کا کھانا کیسا ہوتا ہے، چنو کہتا ہے تو پھر ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔

باہر بچھی بنچ پر تینوں بیٹھ جاتے ہیں۔ چنو ڈھابے والے کو تندوری روٹیاں، دال، سبزی اور دہی لانے کو کہتا ہے۔

گرم گرم روٹیاں آجاتی ہیں۔

اس قدر لذیذ کھانا شاید اس سے پہلے انہوں نے کبھی نہیں کھایا۔ لطف لے لے کر وہ کھاتے رہے۔

''میٹھا سر......؟''

ڈھابے والے نے ان سے دریافت کیا ہے۔ چنو سوالیہ نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھتا ہے، لڑکی عورت کی طرف دیکھتی ہے، عورت آہستہ سے کہتی ہے۔

''کوئی ضروری تو نہیں......''

''یہاں کی کھیر بہت مشہور ہے''۔

کہتے ہوئے چنو تین پیالے کھیر لانے کو کہتا ہے۔

''شہر کا یہی تو طریقہ ہے باجی۔ اچھے اچھے پیسوں والے ہوٹل میں جاتے ضرور ہیں لیکن صرف تفریح یا کولڈ ڈرنک وغیرہ لینے، کھانا تو وہ ڈھابے ہی میں آکر کھائیں گے، آلتی پالتی مار کے جو جی چاہے کھالو......''

مٹی کے کورے پیالوں میں کھیر...... سوندھی، سوندھی، گاڑھی، کیسری رنگ کی کھیر واقعی بہت لذیذ ہے۔ چنو ایک پیالا کھیر رکشا والے کو بھی دیتا ہے۔ سب ہوٹل واپس پہنچتے ہیں۔ رات کافی چڑھ آئی ہے۔ یہ لوگ بھی خوب تھک چکے ہیں۔ چنو بھی جمائیاں لے رہا ہے۔ وہ عورت سے کہتا ہے:

''اچھا باجی، اب آپ لوگ آرام کیجیے، صبح باتیں ہوں گی۔''

وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتا ہے اس وقت لڑکی غسل خانے میں چلی جاتی

ہے، چنو دروازے سے پلٹ آتا ہے اور عورت سے سرگوشیوں میں کہتا ہے۔

''باجی...... دروازہ بند کر کے باہر آیئے تو......''

عورت اس کے کہنے کے مطابق حیران حیران سی کوریڈور میں آ جاتی ہے۔ وہ اسے دوسرے کمرے میں لے جاتا ہے۔ یہ بھی بالکل ویسا ہی کمرہ ہے، وہی بستر، وہی کرسی، وہی میز، وہی کھڑکی، وہی فضا......

''اس کمرے میں، میں ہوں، یہ بات بنّی کو نہ بتایئے گا......''

عورت ہنسنے لگتی ہے، دونوں بستر پر بیٹھ جاتے ہیں، وہ دھیمی آواز میں بولتا ہے۔

''آپ بہت اچھے وقت پر آئیں باجی اور کمال یہ کہ بنّی کو بھی لے آئیں۔ اس وقت سمجھو کہ بازار بہت مندا چل رہا ہے۔ یہ کم بختی کے مارے پیسے خرچ کرتے ہیں تو مال بھی اے ون چاہتے ہیں۔ ہفتوں سے یہ لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں، درجنوں اچھے اچھے دانے انہیں دکھا چکا ہوں، انہیں پسند ہی نہیں آتے، بنّی کو تو ان لوگوں نے......''

''خدا کا شکر ہے اس نے میری لاج رکھ لی......''

عورت درمیان میں آنچل پھیلا کر خدا کا شکر ادا کرتی ہے، چنو کہتا ہے۔

''ابھی اور سنئے باجی...... خوش قسمتی کی انتہا یہ ہے کہ انہوں نے آپ کو بھی......''

''کک...... کیا......؟ کیا کہہ رہے ہو بھائی...... میں، مجھ کو...... کہیں تم......؟''

عورت پر ایک کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔

''ہاں جی...... تو کیا غلط کہوں گا میں...... تم کو...... تم کو...... تم کو......''

چنو ایک خاص ڈرامائی انداز میں عورت کو یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے، عورت کے حواس آتے ہیں، جاتے ہیں، وہ دھیرے سے کہتی ہے۔

''بھلا مجھ میں اب کیا رکھا ہے...... عمر آ گئی، سارے بدن سے ڈھیلی ہو گئی......''

''وہ تو آپ کہہ رہی ہیں نا...... آپ کے پاس ان کی نگاہیں تو نہیں ہیں، ویسے بھی آپ میں جو کچھ بچا ہے، وہ ان چھوکریوں میں کہاں۔ اللہ کی، باجی میں ایسی بات کہہ رہا ہوں جو اور کوئی نہیں کہہ سکتا۔''

عورت غور سے چنو کو دیکھتی ہے، دیکھتی ہی رہتی ہے۔ پھر بہت آہستہ سے پوچھتی ہے۔

"کب دیکھا انہوں نے......؟"

"وہ جو اوپن ایئر میں ہم گئے تھے......وہاں چاروں طرف سے آدمی لگے ہوئے تھے۔ میں بھی تھوڑی دیر کے لئے انہیں کے پاس گیا تھا......باجی، دولت سے اندھے ہیں وہ سب۔ ان کے بکسوں میں، میں نے سونے کے ایسے ایسے بسکٹ دیکھے ہیں کہ بس کچھ پوچھئے مت، آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور بہت دیر تک دیکھنے کے لائق بھی نہیں رہتیں......"

چنو چٹخارے لیتا ہے۔ عورت منھ پھاڑے اس کی باتیں سنتی ہے، پھر درمیان میں چونک کر دریافت کرتی ہے۔

"اور بنّی کا......؟"

"اس کو تو پسند کیا ہی ہے انہوں نے، لیکن اس کو پسند کرنے والے اور ہیں، تم کو پسند کرنے والے اور......"

عورت ٹکر ٹکر اس کا منھ تکتی رہتی ہے۔

"ارے باجی، آپ ابھی تک کچھ سمجھ نہیں پا رہی ہیں۔ یوں سمجھئے کہ آپ کی خوش قسمتی آپ کو یہاں کھینچ لائی ہے۔ آپ کو ایک بار نہیں، سینکڑوں ہزاروں بار خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ باجی، آپ خود سوچئے ہزاروں لڑکیاں یوں ہی ماری ماری پھر رہی ہیں، کوئی نہیں پوچھتا۔ اصل میں یہ لوگ بہت ٹھونک بجا کے اپنی دولت نکالتے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، کچھ نہیں تو پانچ سو لڑکیوں کے انٹرویو لئے ہوں گے انہوں نے۔ کوئی پسند نہیں آئی۔ تمہیں انہوں نے ایک ہی نگاہ میں پسند کر لیا، یہ تمہاری خوش قسمتی نہیں تو اور کیا ہے......؟"

چنو کے الفاظ بہت نپے تلے ہیں۔ ایسا لگتا ہے اسے غیر متوقع خوشی ملی ہے۔ وہ اصل کو بھنانے نکلا تھا، بھن گیا سود، وہ بھی کچھ زیادہ ہی نفع کے ساتھ"۔

وہ ایک لمحے کے لئے رک کر اپنی تقریر کے اثرات عورت کے چہرے پر پڑھنے کی کوشش کرتا ہے، جو ایک ہی جست میں کئی سیڑھیاں نیچے اتر آئی ہے۔ چنو کو اپنی کوشش میں ناکامی ہوتی ہے۔ عورت اس کی باتوں میں کھوئی گئی ہے اور شاید......ابھی بہت کچھ سننا چاہتی ہے۔ چنو کو خود ہی اندازہ نہیں ہے کہ اس نے کس شور انگیز دریا میں اپنی ناؤ ڈال دی ہے اور وہ اسے بہا کر کہاں لے جائے گی۔

پتہ نہیں......

لمحوں کی دیواریں خود ہی اٹھ کھڑی ہوتی ہیں پھر اپنے آپ ڈھ جاتی ہیں۔

عورت کھنکھار کر اپنا گلا صاف کرتی ہے اس کا گلا جذبات سے رندھ گیا ہے۔ وہ گمبھیر آواز میں پوچھتی ہے:

''مجھے کیا کرنا ہوگا بھیا......؟''

''فی الحال تو کچھ نہیں کرنا...... جو کچھ کرنا ہے، ہمیں کرنا ہے۔ اب آپ کا اور بنّی کا پاسپورٹ بنے گا، آپ کو ورک پرمٹ ملے گا، آپ کو وہاں کیئر ٹیکر کا کام سنبھالنا ہے......''

چتو بڑے اعتماد کے ساتھ بتاتا ہے۔

اس کی سیدھی سیدھی بات عورت کو پلے نہیں پڑتی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں وہ چونک کر دریافت کرتی ہے

''کون سا کام بھیا......؟''

''سمجھ لو کہ کوئی کام نہیں۔ بس وہاں چلے جانا ہے اور دونوں ہاتھوں سے دولت اس وقت تک بٹورتے رہنا ہے جب تک تمہارے ہاتھ تھک نہیں جائیں اور وہاں...... وہاں جا کر مجھے بھول مت جانا باجی''۔

چتو ٹھنک کر کہتا ہے، عورت بھی اسی کے رنگ میں جواب دیتی ہے

''کیسے بھول جاؤں گی بھیا۔ تمہاری ہی بدولت تو......''

''ہوتا ہے باجی، خوب ہوتا ہے، وہ جب تمہیں سونے میں تولنا شروع کر دیں گے نا تو پھر تمہیں کچھ بھی یاد نہیں آئے گا۔''

عورت اس کی بات پر خواہ مخواہ جذباتی ہو جاتی ہے۔

''بھیا...... کاغذ پر پکا ٹھپہ لے لو......''

''وہ تو میں کروں گا ہی، لیکن بنّی کی طرف سے ذرا ہوشیار رہنا، مجھے یہ لڑکی کبھی زیادہ ہی ٹیڑھی دکھتی ہے۔ دیکھا نہیں رکشے پر کیسا جان چرا رہی تھی جیسے میں کھا ہی تو جاؤں گا ایک دم سے......''

چتو خاصا سنجیدہ ہو جاتا ہے، عورت کو اس کی ناراضگی کھل جاتی ہے اور وہ بہت لجاجت

سے کہتی ہے:

''ابھی نئی نئی نکلی ہے نا...... ویسے اتنی ناسمجھ بھی نہیں، خوب سمجھتی ہے وہ بھی۔ وہی تو مجھے چھ مہینوں سے پریشان کر رہی تھی۔ ٹھیک ہی ہے، فکر کی کوئی بات نہیں۔''

وہ مطمئن انداز میں مسکراتی ہے۔ چتو بستر پر دراز ہو جاتا ہے۔

''ٹھیک ہے باجی، اب جائیے آرام کیجئے اور اوپر والے کے سو سو شکر ادا کیجئے۔ آپ کو اب عیش ہی عیش ہے۔ میں بھی آج جی بھر کے سوؤں گا، ہفتوں کی ٹینشن آج دور ہوئی......''

(۲)

عورت واپس آتی ہے تو لڑکی کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی ہوتی ہے، وہ اس کو کندھے سے ہلاتی ہے۔

''تم بستر پر سو کیوں نہیں گئیں بنّی؟''

لڑکی ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیتی ہے اور متوحش نگاہوں سے عورت کی طرف دیکھتی ہے۔

''مجھے ڈر سا لگ رہا تھا...... آپ کہاں چلی گئی تھیں بوا......؟''

''کہاں جاتی...... باہر چتو سے باتیں کر رہی تھی۔ ہم لوگوں کا کام بن گیا ہے، تین چار دن میں کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔''

عورت ہوشیاری سے مختصر طور پر اسے بتاتی ہے۔ لڑکی کے چہرے پر ایک رنگ آ جاتا ہے جو شاید خوشی کا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ چپ چاپ بستر پر لیٹ جاتی ہے اور چند ہی لمحوں کے بعد گہری نیند میں ڈوب جاتی ہے۔

عورت کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے چہرے پر سوچ اور فکر کی لکیریں نمایاں ہیں۔ تھکاوٹ کے باوجود اس کی آنکھوں میں دور دور تک نیند کا پتہ نہیں۔ چتو کی باتیں اس کے پورے جسم میں تیز کرنٹ کی طرح دوڑ رہی ہیں، جو بات اس نے کبھی سوچی بھی نہیں تھی۔

وہ بات......

ایک بڑا معجزہ جیسے اس کے ساتھ سرزد ہو گیا ہے۔ وہ عمر کی اس منزل میں ہے جب جسم کے اعضا دھیرے دھیرے ڈھیلے ہونا شروع ہو جاتے ہیں، **Sensitivity** ختم ہونے لگتی ہے، نشیب و فراز بھرنے لگتے ہیں، نکیلا پن، سپاٹ پن میں تبدیل ہونے لگتا ہے، بالوں میں چاندی جھلکنے لگتی ہے، چہرے پر دیر تک نظریں ٹکتی نہیں، چال میں ایک خاص قسم کی سستی پیدا ہو جاتی

ہے جسے دیکھنے والے وقار یا سنجیدگی کا نام دیتے ہیں، خواہ مخواہ ہنسنے اور بے ساختہ مسکرانے کو بالکل جی نہیں چاہتا۔

اس کی شادی ایک بے حس قسم کے آدمی کے ساتھ ہوئی تھی۔ بچّے نہیں ہوئے، وہ اپنی تھوڑی سی کھیتی میں ہمہ وقت مصروف رہتا اور بس اتنا ہی پیدا کر پاتا کہ شکر کے ساتھ کسی طرح دو وقت کی روٹی اور سال سال کے دو جوڑے کپڑوں کا انتظام ہو جائے۔ زندگی ایک شانت ندی کی طرح بس بہے جا رہی تھی، کوئی لہر نہیں، کوئی طوفان نہیں، کوئی منزل نہیں، دور دور تک کوئی بھی ایسا نہیں جو کبھی کبھار ہی سہی شانت ندی میں ایک کنکر پھینک دے۔

یکسانیت اور پھیکے پن سے مجبور ہو کر اس کے قدم گھر سے باہر نکلے۔ گاؤں میں بے سہارا، اناتھ اور غریب لڑکیوں کی ایک فوج کھڑی ہوئی تھی، اس نے ان کے مستقبل سنوارنے کا بیڑہ اٹھایا اور جس کام میں ہاتھ ڈالا، خدا نے لاج رکھی۔

لیکن اس چتو نے......

چتو نے ایسا کیا کہہ دیا ہے کہ اس کی پوری دنیا بدلتی نظر آ رہی ہے، یقین اور بے یقینی کی ایک ایسی فضا ابھر آئی ہے کہ سب چیزیں اس میں دھندلی دکھائی پڑ رہی ہیں۔ کوئی تو کبھی کچھ کہتا، اشارے کنائے میں کوئی بات تو سامنے آتی، گھور پیاسی زمین میں کوئی تو پانی کے چھینٹے ڈالتا، زندگی کے لق و دق صحرا میں کہیں تو کوئی سایہ نظر آتا۔

لیکن نہیں......

دور دور تک کچھ نہیں......

حد نظر تک چٹیل اور ہریالی سے بالکل محروم لق و دق میدان......

ایسے میں بالکل غیر متوقع طور پر اچانک جیسے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ وہ بستر پر بے سدھ پڑی لڑکی کو نظر بھر کے دیکھتی ہے۔ اٹھارہ انیس سال کی الھڑ دوشیزہ کس بے ترتیبی سے کہاں کھوئی ہوئی ہے، اسے اپنی کوئی سدھ بدھ نہیں۔ اس کے گداز، تر و تازہ اور مٹی کے کورے برتن جیسے بدن میں مقید سینے کے زیر و بم سے سانس کی لرزشیں یوں ابھر اور ڈوب رہی ہیں کہ جیسے کسی شانت سمندر میں ایک سہما سہما تلاطم سا آ رہا ہو۔ جسم کے اعضا یوں بکھر گئے ہیں جیسے کسی ماہر بت تراش نے انہیں بنا کر اس لئے رکھ چھوڑا ہو کہ کبھی فرصت کے اوقات میں انہیں مناسب ڈھنگ

سے جوڑے گا۔ چہرے پر جوانی کی سرخیوں کی اس قدر شدت ہے کہ ان میں مستقبل کے فکر کی پرچھائیاں کھو سی گئی ہیں۔ وہ اس قدر مطمئن اور اعتماد بھرے انداز میں سوئی ہے جیسے صبح اس کی ہوگی...... صرف اس کی۔

عورت اٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوتی ہے۔

یہ کیا......؟

کیا یہ وہی ہے......؟

کچھ دیر پہلے بھی آئینے پر اس کی نظر پڑی تھی، اپنے اعضا پر اس نے اجنبی نگاہیں ڈالی تھیں اور ان سے سرسری گزر گئی تھی۔

لیکن اس وقت تو......

اس وقت تو آئینہ کچھ اور ہی کہہ رہا ہے۔

کوئی اور ہی تصویر دکھا رہا ہے۔

کوئی اور چہرہ...... کوئی اور ہی جسم......

اس چہرے پر شادابی ہے، اس جسم میں رعنائی ہے۔

نکیلا پن...... لوچ پن...... اپنا پن......

اجنبی دنیا کی خوشبوئیں نامعلوم سمتوں سے آ رہی ہیں۔ اسے پسند کیا گیا ہے۔

غیر ملکوں سے آنے والے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے، ٹھوک بجا کے دام لگانے والے......

انہوں نے اسے پسند کیا ہے۔

ان لوگوں نے جو بہت دنوں سے اصل حسن کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں پر قسم قسم کے چشمے چڑھے ہیں۔ وہ اس قدر دنیا دیکھے ہوئے لوگ ہیں کہ انہیں دھوکا دیا ہی نہیں جا سکتا۔

گویا......

یعنی......

اس کے اندر ابھی اتنا کچھ باقی ہے۔ یعنی جو رتن ابھی تک مٹی میں رُلتا رہا ہے، اسے

پہچاننے والی نگاہیں آ پہنچی ہیں۔

کروڑوں، اربوں انسانوں کے اس جنگل میں یہ نگاہیں اب تک کہاں چھپی تھیں......؟

چنو جیسے آدمی کی زبان سے شاید پہلی بار ایسی باتیں نکلی ہیں جنہیں سچ اور سچ کے سوا اور کچھ نہیں ماننے کو جی چاہتا ہے۔

اس لئے نہیں کہ اس نے اس کے بارے میں کچھ کہا ہے بلکہ خود اس کی اپنی نگاہیں بھی اس کی تصدیق کر رہی ہیں جو اس کی درخواست پر اس وقت بے رحم، سخت ناقد بن چکی ہیں۔ ان پر بھروسا کر لینے میں کوئی حرج نظر نہیں آتا۔

وہ پلٹ کر ایک بار پھر لڑکی کی طرف دیکھتی ہے۔ اس نے اپنے تمام گھوڑے بیچ رکھے ہیں...... راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ اس وقت تک نہیں اٹھے گی جب تک اس کے سرہانے قیامت کا شور برپا نہ ہو جائے۔

کمرے میں دھیمی روشنی پھیلی ہوئی ہے، نیلے رنگ کی ہلکی، دھیمی روشنی ایک پراسرار فضا کے راز کھول رہی ہے اور وہ بھی اس وقت......؟

آدھی رات کے سائے ہیں......

اس نے آہستہ آہستہ اپنے کپڑے اتارنے شروع کئے۔

ایک ایک کر کے......

ایک ایک کر کے......

اس کے ہاتھ لرزتے رہے۔

پہلے جب وہ ضرورتاً ایسا کرتی تھی تو اس کے ہاتھ مشینی انداز میں اٹھتے تھے اور اپنا کام شروع کر دیتے تھے۔

لیکن آج......

آج تو کوئی اور ہی دن ہے۔

آئینے کے سامنے سرتاپا برہنہ کھڑے ہونے کا اس کا تجربہ بالکل انوکھا ہے۔ قدِ آدم آئینہ اس نے آج سے پہلے دیکھا بھی کہاں تھا۔

برس ہا برس سے آئینے کا ایک چھوٹا سا بھدا ٹکڑا طاق پر دھرا رہتا جس میں شکل دیکھنے کی

خواہش بھی نہ ہوتی، صرف بہ وقت ضرورت، رونی صورت کو کسی طرح ہنستا بنانے کے لئے۔

ہفتوں آئینہ دیکھے بغیر گذر جاتے کہ ہنستی صورت کی کوئی ضرورت محسوس ہی نہ ہوتی۔

لیکن آج......

آج تو آئینے نے اپنے معنی ہی بدل ڈالے ہیں۔ آج ہی انکشاف ہوا کہ آئینے میں شکل نہیں، جسم بھی دیکھے جاتے ہیں بلکہ شاید...... جسم ہی دیکھے جاتے ہیں۔

خوب صورت جسم......

جیسے اس کا جسم......

اس نے پہلی بار اپنے جسم کے حصّوں کو اس قدر دلچسپی سے دیکھا ہے۔ اس کے اندر ایک عجیب قسم کی خوشی پیدا ہوئی ہے۔

لہراتے ہوئے بال......

صراحی دار گردن......

جاذب نظر چہرہ......

سینے کی گداز گولائیاں......

بل کھاتی ہوئی کمر......

سر سے پیر تک بھرپور بدن......

وہ ساری چیزیں جو اس لڑکی کے پاس ہیں، اس کے پاس بھی ہیں بلکہ ابھی ابھی اس کے پاس آئی ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے وجود کی کتاب ابھی ابھی کھلی ہے اور جاہل ہونے کے باوجود وہ اسے فرفر پڑھ رہی ہے۔ اس کا جی نہیں چاہتا کہ یہ کتاب کبھی ختم ہو۔

بار بار اسے پڑھتے ہوئے بھی اسے نئے پن کا احساس ہو رہا ہے۔

وقت گزرا جا رہا ہے۔

رات بھیگتی جا رہی ہے۔

لیکن اس کی نگاہوں کے سامنے تو......

اس کی نگاہوں کے سامنے تو پوری کی پوری رات ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔ وقت اس کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

(۳)

رات کا آخری ہی پہر رہا ہوگا بلکہ آخری پہر کا بھی آخری لمحہ کہ اس کے شروع کے لمحات تک تو وہ جاگتی ہی رہی تھی، کس وقت آنکھ لگی کچھ پتہ نہیں اور آنکھیں بھی نہیں کھلتیں اگر لڑکی اسے بری طرح جھنجھوڑ نہیں ڈالتی۔

''بوا...... جلدی اٹھئے...... باہر بہت ہنگامہ ہو رہا ہے...... نہ جانے کیا بات ہے؟''

وہ آنکھیں ملتے ہوئے جلدی سے اٹھ بیٹھتی ہے۔ شکر ہے کہ بے سدھ ہونے کے باوجود سونے سے پہلے اس نے کپڑے پہن لئے تھے ورنہ اس وقت بنّی کے سامنے کیسی شرمندگی ہوتی۔

باہر واقعی کچھ غیر معمولی شور ہے، بوٹوں کی ٹاپ ٹاپ...... شاید بہت سے لوگ ہوٹل میں گھس آئے ہیں...... بہت زیادہ بولنے کی آوازیں......

عورت اپنے ہوش وحواس جمع کر کے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے اور فوراً سمجھ بھی جاتی ہے شاید...... کیوں کہ اچانک وہ بہت زور سے چونکتی ہے۔ لڑکی اس کی تبدیلی کو محسوس کرتی ہے اور گھبرا کر پوچھتی ہے۔

''کیا ہوا بوا......؟ کیا ہوا......؟ طبیعت تو ٹھیک ہے......؟''

''بنّی...... لگتا ہے یہاں کوئی لفڑا ہو گیا ہے، لیکن تم گھبرانا مت۔ کوئی سوال جواب کرے تو میں جواب دے لوں گی۔ تم صرف سر ہلاتی رہنا۔ خدا چاہے گا تو سب ٹھیک ہو رہے گا...... بالکل فکر نہ کرنا......''

لڑکی حیرت سے اسے دیکھتی ہے۔

''آخر کہنا کیا چاہتی ہیں بوا......؟ اس طرح تو وہ کبھی......''

لیکن اسے کسی نتیجے پر پہنچنے کا موقع بھی نہیں ملتا ہے کہ دروازے پر زوردار ٹھوکریں لگتی ہیں۔ لگتا ہے دروازہ فوراً کھولا نہیں گیا تو توڑا بھی جا سکتا ہے۔

عورت کے روکتے روکتے لڑکی گھبرا کر پوچھ بیٹھتی ہے۔

''کون ہے......''

''دروازہ کھولو......''

بے حد کرخت آواز میں حکم ملتا ہے۔

چند مختصر ترین لمحے تذبذب میں بیت جاتے ہیں۔ دروازے پر بوٹ مارنے کی آواز آتی ہے۔ عورت جلدی سے دروازہ کھول دیتی ہے۔ وردیوں میں ملبوس پولس کے کئی افراد دھڑ ادھڑ اندر داخل ہو جاتے ہیں، ایک آفیسر نما شخص کڑک کران سے پوچھتا ہے۔

''کون ہو تم لوگ......؟ یہاں کیوں آئے ہو......؟''

''میں......مہر النسا اور یہ میری بھتیجی بنی......''

عورت اعتماد بھرے لہجے میں جواب دیتی ہے۔

''یہاں آنے کا مقصد......؟''

اسی کرخت لہجے میں دریافت کیا جاتا ہے۔

''علاج......اس لڑکی کو زنانہ مرض ہے......''

عورت کو اچانک ہم سفر باتونی عورت یاد آجاتی ہے۔

''اس ہوٹل کا کرایہ کس نے دیا ہے......؟''

سوالات توپ کے دہانے سے چھوٹ رہے ہیں۔

''میرے بھائی نے......''

عورت لجاجت سے جواب دیتی ہے۔

''کہاں ہے تمہارا بھائی......؟ کیا نام ہے اس کا......؟''

''ذوالفقار حیدر۔ وہ اس شہر میں رہتا ہے''۔

وہ بہ دستور شانت انداز میں جواب دیتی ہے۔

''تم بھائی کے ہاں کیوں نہیں ٹھہریں......؟''

''اس کی بیوی......حضور، اس کی بیوی ایسی زہر ہے کہ اس نے تو ماں باپ بھائی بہن، سب کو اس سے چھڑا دیا، شکل نہیں دیکھنا چاہتی ہم سب کی، وہ بچارہ بھی کیا کرے، زندگی تو اس کے ساتھ بتانی ہے نا سو بہت مجبوری میں اس نے ہمیں یہاں ٹھہرا دیا ہے......''۔

عورت کہیں پر جھجکی نہیں، لڑکی اس کی ذہانت پر دل ہی دل میں عش عش کر رہی ہے پولس آفیسر کی نگاہوں میں بے اعتباری ہے۔

''اگر ذوالفقار حیدر یعنی پچو تمہارا بھائی ہے تو وہ ایک نامی کریمنل ہے۔ ایک بین

الاقوامی بردہ فروش گروہ کا انڈین بروکر...... پولس کو بہت دنوں سے اس کی تلاش ہے چوں کہ چنو بڑے گھروں کی بلی ہے اس لئے پکڑ میں نہیں آتا۔ تم صاف صاف بتاؤ، تم سے اس کا کیا رشتہ ہے......؟''

پولس آفیسر کا لہجہ کچھ زیادہ ہی سخت ہو گیا ہے۔ عورت کے چہرے پر ایک ہلکا دھواں سا اٹھتا ہے لیکن وہ فوراً اس پر قابو پا لیتی ہے۔ لڑکی اس کی تبدیلی کو محسوس کرتی ہے لیکن کچھ بولتی نہیں۔

''اب حضور، میرا بھائی کیا کرتا ہے کیا نہیں کرتا، یہ تو آپ ہی صحیح جانتے ہوں گے، میں تو اس کی دکھیا بہن اس کے بارے میں جو کچھ جانتی ہوں، اچھا ہی جانتی ہوں......''

عورت روہانسی ہو جاتی ہے۔

''تمہاری پہچان بھی چھپ نہیں سکے گی، جانتی ہو نا پولس پاتال سے بھی مجرم کو کھینچ نکالتی ہے......تم کتنا صحیح کہہ رہی ہو، کتنا غلط، اس کا پتہ تو ہمیں چل ہی جائے گا......''

پولس آفیسر لاپرواہی سے کہتا ہے اور سپاہیوں کو کمرے کی تلاشی لینے کا حکم دیتا ہے۔ تلاشی کا کام منٹوں میں ختم ہو جاتا ہے، یوں وہاں تھا ہی کیا، دو تھیلے جن میں پولس والوں کے لئے بے کار چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ پولس آفیسر غور سے لڑکی کی طرف دیکھتا ہے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دریافت کرتا ہے۔

''جو کچھ یہ کہہ رہی ہے، سچ ہے......؟''

لڑکی اتنی دیر میں کافی کچھ سیکھ چکی ہے، وہ بہت معصومانہ انداز میں سر ہلا دیتی ہے۔ آفیسر ڈپٹ کر کہتا ہے:

''منہ سے بول، گونگی ہے کیا......؟''

''یہ میری بوا ہیں اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے سچ کہا ہے......''

لڑکی گھبرائے بغیر سادگی سے جواب دیتی ہے۔

''بہت گھاگ معلوم ہوتی ہے۔''

پولس کا ایک آدمی، آفیسر کے کان میں کہتا ہے، سب ہی سن لیتے ہیں۔

''جائیں گی کہاں......؟ چنو تو سب اگل ہی دے گا مار کھا کے......''۔

پولس آفیسر اچٹتی ہوئی نگاہیں عورت اور لڑکی پر ڈالتا ہے۔ وہ دونوں انجان سی

بنی رہتی ہیں۔

''ان کا کیا کرنا ہے سر......؟''

پولس کا آدمی، آفیسر سے پوچھتا ہے۔

''ابھی کچھ نہیں کرنا''

آفیسر معنی خیز انداز میں سر ہلاتا ہے اور گہری نگاہوں سے دونوں کو دیکھتا ہے۔ سب دھڑا دھڑ باہر نکل جاتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد لڑکی دھم سے کرسی پر گر جاتی ہے اور گم صم کھڑی عورت سے پوچھتی ہے۔

''اب کیا ہوگا بوا......؟ یہ سب کیا ہو گیا......؟''

''خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہی رہے گا بنّی......''

عورت اسے دلاسا دیتی ہے۔

''کیا سچ مچ چتو چاچا......؟''

''خدا کو معلوم......ہم کو یہ سب کیا پتہ......تم تو جانتی ہی ہو اس سے کتنے دنوں کا سمبندھ ہے......''

عورت اپنی صفائی دیتی ہے۔ لڑکی اچانک سسکنے لگتی ہے، عورت اس کے پاس ہی بیٹھ جاتی ہے اور اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتی ہوئی اسے سمجھاتی ہے:

''تم کیوں اتنا پریشان ہو رہی ہو بنّی......؟ میں ہوں نا، میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گی، اطمینان رکھو۔ ہم یہاں آئے ہیں تو کامیاب ہو کر ہی جائیں گے۔''

''بوا، آپ نے تو مجھے کوئی بات صاف صاف نہیں بتائی نا۔ میں تو یہاں آپ کے ساتھ نوکری ڈھونڈنے آئی تھی لیکن یہاں تو بالکل دوسری ہی بات......''

لڑکی بلک پڑتی ہے۔

''تمہیں پتہ بھی ہے بنّی، چتو نے تمہارے لئے کتنی بڑی نوکری کا انتظام کر رکھا تھا، تم سونے چاندی میں کھیلتیں، ہیرے جواہرات میں رولتیں......''

عورت بہت ہی پرامید لہجے میں لڑکی کو دلاسا دیتی ہے۔ لڑکی آنسو بھری آنکھوں سے بے یقینی کے انداز میں اس کی طرف دیکھتی ہے۔

''بھلا مجھ جاہل کو کون جواہرات میں کھیلنے دے گا بوا......؟ پتہ نہیں انہوں نے کیا بتایا اور تم نے کیا سمجھا......''

''اب اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں میں......تم سے پہلے لڑکیاں میرے ساتھ نہیں آئی تھیں کیا......؟ آج سب ہزاروں روپے اپنے گھروں کو بھیج رہی ہیں یا نہیں......؟ میں غلط کہہ رہی ہوں تو بولو۔ چنو نے تین چار روز انتظار کرنے کو کہا تھا، ساری باتیں طئے ہو چکی تھیں اور تو اور ایک بات بتاؤں گی تو حیرت میں پڑ جاؤ گی''۔

عورت سے مارے جوش کے برداشت نہیں ہوتا۔ اس کے دل کی بات زبان پر آ جاتی ہے۔ لڑکی کی آنکھوں میں بے یقین گھٹائیں منڈلاتی رہتی ہیں، وہ کسی حیرت کا اظہار نہیں کرتی، عورت بھی اپنی دھن میں اس کی بے رخی کی پرواہ نہیں کرتی اور اپنی کہے جاتی ہے۔

''اس نے......اس نے تو میری نوکری کا بھی انتظام کر دیا۔ تم خود سوچو، اب تک تو میں ہوا میں اس پتنگ کی مانند اڑتی رہی ہوں جسے کوئی کاٹنا بھی پسند نہیں کرتا، میری زندگی کا کیا مصرف تھا ابھی تک......؟''

لڑکی بے یقینی کی گھٹاؤں سے نکل کر اس کی طرف غور سے دیکھتی ہے، عورت کی بات کچھ اس کے پلے نہیں پڑتی۔ وہ آہستہ سے کہتی ہے۔

اب ہو گا کیا یہ سوچنا ہے۔ میں تو واپس نہیں جاؤں گی بوا، چاہے یہاں بھیک ہی کیوں نہ مانگنی پڑے......''

''بھیک مانگیں تمہارے دشمن اور تم واپس جانے کو تھوڑی یہاں آئی ہو۔''

عورت یقین بھرے لہجے میں کہتی ہے۔

''ہوٹل تو چھوڑنا پڑے گا نا بوا......اس کا کرایہ......؟''

لڑکی فکرمندی سے دریافت کرتی ہے۔

''ایک دن کا کرایہ تو اس کا دیا ہوا ہے شاید......ہو سکتا ہے چنو نے کوئی انتظام کر رکھا ہو، وہ ہے بہت تیز۔''

عورت دبی زبان سے کہتی ہے، جیسے اپنے آپ کو دلاسا دے رہی ہو اور اٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹا دیتی ہے۔

پو پھٹ رہی ہے۔ نیچے پولس کی گاڑیاں اسٹارٹ ہو رہی ہیں، بہت ساری تیز روشنیاں جل اٹھی ہیں۔ ''ساری رات یوں ہی گزر گئی......''

عورت دھیرے سے کہتی ہے۔لڑکی گم صم اس کا منھ دیکھتی رہتی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ ہوٹل کا لڑکا چائے لے کر داخل ہوتا ہے اور ایک چھوٹا سا ٹیڑھا میڑھا پرزہ عورت کی طرف بڑھاتا ہے۔اس پر کے حروف عورت کے لئے بھینس برابر ہیں۔ وہ اس پرزے کو لڑکی کی طرف بڑھا دیتی ہے۔لڑکی خوب غور سے پرزے پر کسی تحریر کا مطالعہ کرتی ہے۔

''اس پر تو شاید کسی کا پتہ لکھا ہے......کوئی شیلا دیوی......''

لڑکی بیزاری سے بتاتی ہے لیکن عورت کے چہرے پر اچانک قوسِ قزح کھل اٹھتا ہے اور وہ بہت خوش ہو کے کہتی ہے:

''بہت حفاظت سے رکھنا اس پرزے کو...... چنو نے بھیجا ہے۔ہم یقیناً کسی محفوظ جگہ پر جا پہنچیں گے۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ چنو اتنا بے وقوف نہیں کہ ہمیں بالکل تنہا چھوڑ دے۔''

دونوں جلدی جلدی چائے ختم کر کے اپنا سامان سمیٹتی ہیں۔ چند ہی منٹوں میں دونوں تیار ہو کر اپنے تھیلے اٹھائے نیچے آجاتی ہیں۔

ہوٹل ابھی تک سراسیمگی کے کہرے میں لپٹا ہوا ہے۔ لوگ ٹولیوں میں بے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ عورت لڑکی کے کان میں کہتی ہے حرکات و سکنات سے ہرگز کوئی گھبراہٹ ظاہر نہ ہونے پائے۔ کاؤنٹر کے پاس ہوٹل کا منیجر انہیں غور سے دیکھتا ہے اور دھیرے سے کہتا ہے۔

''آپ سے بھی تو پوچھ گچھ ہوئی تھی میڈم...... ہو سکتا ہے۔ وہ پھر آئیں، اپنا پتہ تو بتاتی جائیے......''

عورت بہت اعتماد کے ساتھ ایک پتہ لکھاتی ہے۔ لڑکی کنکھیوں سے عورت کی طرف دیکھتی ہے۔ منیجر کی آنکھوں میں انہیں دیکھ کر شک و شبہات کے جو سائے جھلملائے تھے وہ دھیرے دھیرے معدوم ہونے لگتے ہیں۔

وہ باہر نکل آتی ہیں۔

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے......''

عورت بہت خوش ہے۔ لڑکی سوچتی ہے کہ بوا تو ہر معاملے میں فٹ ہیں، وہ نہ ہوتیں تو اس کا کیا حشر ہوتا۔ وہ عورت سے پوچھتی ہے۔

''ابھی کہاں چلنا ہے بوا......؟''

''اسی پتے پر چلو، سویرے سویرے وہاں پہنچ جائیں۔ ہوسکتا ہے چتو کا کوئی اور پیغام ہمارا منتظر ہو......''

دونوں ایک رکشے میں بیٹھ جاتی ہیں اسے پتہ بتاتی ہیں، رکشہ فراٹے بھرنے لگتا ہے۔

(۴)

کوئی پندرہ منٹ کے بعد وہ ایک شاندار کوٹھی کے دروازے پر ہیں۔ مسلح پہرے داروں کی شکلیں انتہائی خوف ناک ہیں۔ لڑکی انہیں دیکھ کر گھبرا جاتی ہے۔ عورت خوش ہے۔ وہ ذرا نہیں گھبراتی اور لڑکی کے کان میں کہتی ہے۔

''دیکھا میں نہ کہتی تھی چتو نے کتنا اچھا انتظام کر رکھا ہے، یہاں تو پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔''

''پہلے اندر تو چلئے بوا......''

لڑکی بیزاری سے کہتی ہے۔ عورت آگے بڑھ کر پہرے داروں سے کچھ باتیں کرتی ہے جو انہیں اتنی دیر وہاں کھڑے دیکھ کر غرا رہے ہیں۔ ایک پہرہ دار ہاتھ میں پکڑے ایک آلے سے کچھ باتیں کرتا ہے، درمیان کہیں ذوالفقار حیدر کا نام آتا ہے۔ پہرہ دار آلے پر ہاتھ رکھ کر عورت سے کچھ دریافت کرتا ہے، وہ زور زور سے اپنا سر ہلاتی ہے۔ ادھر سے شاید کچھ اشارہ ملتا ہے۔ فوراً ہی پہرے دار انہیں اندر جانے کا اشارہ کرتے ہیں۔

اندر کی دنیا کچھ اور ہی ہے۔ عورت جہاں دیدہ ہے۔ وہ اپنے بہت سے جذبات کو چھپانے کا فن جانتی ہے۔ لڑکی اس کے اشاروں کو اب خوب سمجھتی ہے اور اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ دنیا انہوں نے کبھی اپنی سوچ میں بھی نہیں سجائی تھی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں لیکن اس چیز پر وہ بڑی خوبصورتی سے قابو پانے کی کوشش کرتی ہے۔

ایک خوش اخلاق، خوب صورت عورت آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرتی ہے۔

میں کمد چگانی ہوں، شیلا دیوی کی سکریٹری، آپ لوگ شاید......''

''ذوالفقار حیدر نے بھیجا ہے ہمیں۔''

عورت فوراً جواب دیتی ہے۔ لڑکی عورت کی Smartness دیکھ کر دنگ ہے۔

سکریٹری انہیں مختلف راہ داریوں اور روشوں سے گزارتے ہوئے ایک سجے سجائے خوب صورت کمرے میں لے آتی ہے۔ ہوٹل کا وہ کمرہ جہاں انہوں نے رات بتائی تھی اس کمرے کے سامنے تو کہیں ٹھہرتا ہی نہیں۔

دھنسنے والے ایک صوفے پر انہیں بیٹھاتے ہوئے کمد چگانی خود ایک مرصع کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور بے تکلفی سے کہتی ہے:

''آپ یہاں آرام سے رہئے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف کہیۓ گا، لیکن آپ کے کپڑے...... خاص طور پر اس لڑکی کے کپڑے ہرگز مناسب نہیں، میں بھجوائے دیتی ہوں''۔

کمد انہیں حیران چھوڑ کر باہر چلی جاتی ہے۔ کمرے میں اندر اسرار کی ایک دھندسی چھا جاتی ہے۔ عورت کے پاس دھند میں اچانک چتو کا چہرہ دکھائی دے جاتا ہے، وہ راحت سا محسوس کرتی ہے۔ کمد کپڑے لے کر واپس آتی ہے۔

''نہا دھو کر کپڑے تبدیل کر لیجئے، پھر باتیں ہوں گی''۔

اس کے جانے کے بعد عورت لڑکی کو غسل خانے کا اشارہ کرتی ہے، لڑکی اپنے کپڑے لے کر غسل خانے میں گھس جاتی ہے، لیکن فوراً واپس آ جاتی ہے۔ اس کے چہرے پر سخت الجھن کے آثار ہیں۔ عورت کو وہ ساتھ لے کر پھر غسل خانے میں جاتی ہے تو عورت بھی چکرا جاتی ہے۔

اور سب تو ٹھیک ہے لیکن کموڈ...... کونے میں ایک کرسی سی بچھی ہے۔ اس کے پینیدی میں کچھ پانی ہے...... دونوں بہت توجہ سے غسل خانے کے لوازمات کا معائنہ کرتی ہیں۔ اس درمیان لڑکی کا ہاتھ اچانک فلش کے بٹن پر پڑ جاتا ہے۔ پانی کا ایک زوردار طوفان آ جاتا ہے۔ لڑکی ڈر کر جلدی سے عورت سے لپٹ جاتی ہے۔ طوفان جتنی تیزی سے آیا، اتنی ہی تیزی سے گیا۔ ایسا ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

ایک لمحے کے لئے دونوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا، دوسرے ہی لمحے لڑکی کو بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے۔ وہ بہت جوش کے عالم میں عورت کو بتاتی ہے:

''سمجھ گئی بوا، بالکل سمجھ گئی، سب سے پہلے اس کرسی پر بیٹھنا ہے، فارغ ہو جائیں تب اس بٹن کو ہاتھ لگا دینا ہے، بس سب صاف......''

عورت کی سمجھ میں نہیں آتا، وہ لڑکی سے کہتی ہے:

''خیر وہی ہوگا، اب جلدی سے تم کرلوتو میں بھی کر کے دیکھوں''۔

وہ باہر آجاتی ہے۔لڑکی غسل خانہ بند کرلیتی ہے۔تھوڑی دیر کے بعد تھوڑا سادروازہ کھول کرعورت سے کہتی ہے:

''دیکھابوا......وہی ہوانا آخر......''

عورت مسکرا کر اسے دیکھتی ہے۔

''اب جلدی نہا کر بھی نکلو''۔

جو کپڑے انہیں کمد دے گئی ہے، وہ ان پر بالکل فٹ آتے ہیں، قد آدم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر وہ محسوس کرتی ہیں کہ یا توان کی جون بدل گئی ہے یا وہ کسی اجنبی دنیا میں جانکلی ہیں۔ منھ سے کچھ نہیں نکلتا لیکن احساسات دونوں کے بالکل ایک جیسے ہیں۔

عورت اچانک بول اٹھتی ہے:

''بالکل صحیح کہتا تھا چنو......''

''کیا......؟''

لڑکی بھی چونک کر احساسات کے کہرے سے باہر نکلتی ہے۔

''یہی کہ اس نے ہمارے لئے بہت اچھی نوکری کا انتظام کردیا ہے۔ہم نے کبھی سوچا بھی تھا بنّی......؟''

عورت کا لہجہ احسان مندی سے شرابور ہے۔لڑکی اکتائے ہوئے انداز میں کہتی ہے:

''ابھی تک تو کچھ دکھائی نہیں دیا......؟''

عورت تنک اٹھتی ہے۔

''کمال کرتی ہو بنّی......اس وقت چنو نہ ہوتا تو ہم در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے، عزّت وناموس کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔یہاں تو ہم شاہی مہمان ہیں جب کہ پڑھی لکھی لڑکیاں در در کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں''۔

''کون سا آسمان ٹوٹ پڑتا۔مزدوری کرتے،گھروں میں جھاڑو پوچھا کا کام کرتے......''۔

لڑکی کا لہجہ قدرے تیکھا ہے۔پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہی ہے۔

''کرنے کے تو بہت سے کام ہیں پر عزت نہ بچتی، یہ جان لو......''
عورت منھ بنا کر کہتی ہے۔ لڑکی ابھی کوئی جواب نہیں دیتی، کمد کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے ناشتے کی ٹرالی ڈھکیلتے ہوئی ایک خادمہ...... کمد انہیں دیکھ کر مسکراتی ہے۔
''آپ تیار ہو گئیں......؟ آیئے ناشتہ کر لیجئے''۔
ناشتے کی ٹرالی پر ایسی ایسی چیزیں سجی ہیں کہ نوے فیصد چیزوں کو تو وہ پہچانتی بھی نہیں۔ بس کمد کو دیکھ دیکھ کر احتیاط کے ساتھ ایک ایک چیزیں اٹھاتی ہیں۔
پیٹ ان کا پہلے بھر گیا، دل بہت بعد میں بھرا، ناشتہ بہت دیر میں ختم ہوا۔ لڑکی سوچتی ہے ان لوگوں کے پاس کتنا وقت ہے...... وقت ہی وقت...... دولت کی طرح...... اسے خرچ بھی یہ لوگ دولت ہی کی طرح کرتے ہیں، دھیرے دھیرے، آہستہ آہستہ......
عورت اور کمد پتہ نہیں کن باتوں میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ لڑکی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ وہ اونگھنے لگتی ہے، کمد اسے دوسرے کمرے میں سونے کو بھیج دیتی ہے۔ وہ کمرہ بھی بہت آرام دہ ہے۔ گدے دار بستر پر لیٹتے ہی وہ خوابوں کی دنیا میں کھو جاتی ہے۔
عورت نے چتو کے بارے میں جو بڑے بیانات دیئے ہیں۔ کمد انہیں ایک ہی وار میں ڈھا دیتی ہے۔
''ہاں...... ہاں جانتی ہوں اس کو...... یہ کام بڑے جان جوکھم کا ہے، چتو جیسے بچو لیئے کے بس کی بات نہیں۔ بھلا بتایئے، کس طرح پولس نے چھاپہ مارا اور کس اطمینان سے وہ گرفتار ہو گیا۔ ایسے لوگوں سے ہم کوئی سمبندھ نہیں رکھتے، اپنا Reputation ہی خراب ہوتا ہے۔
عورت سے کوئی جواب بن نہیں پڑتا۔ وہ بس کمد کی شکل دیکھتی رہتی ہے۔
چتو نے اس کے اندر جو گم شدہ خوبصورت وادیاں تلاش کی تھیں۔ ان کی ہریالی اچانک مرجھانے لگی ہے۔ انہیں جس آب پاشی کی ضرورت ہے اس کا سرچشمہ صرف چتو کے پاس ہے اور چتو پولس کی حراست میں ہے۔
وہ بات بار بار اس کی زبان پر آنا چاہتی ہے لیکن اندر اندر کوئی لگام اسے تھام لیتی ہے۔ مضبوط...... ایک بہت ہی مضبوط پھانس ہے جو اس پر رہ رہ کے حاوی ہوتی جاتی ہے۔ کمد لڑکی کی تعریف کر رہی ہے...... اس کا حسن کورا برتن ہے...... فطری آب و ہوا میں پلا ہوا جسم...... ایک

خاص قسم کا اچھوتا پن...... دیکھنے سے دل کی دیوار پر ایک تصویر سی بنتی ہے۔

لیکن واقعی نئی اور انوکھی باتیں تو چتو کے منھ سے نکلی تھیں۔ اس نے ایک اچھوتی اور نئی دنیا کے دروازے اس کے سامنے نہیں کھول دیئے ہوتے تو وہ یقیناً اس وقت در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہوتیں...... چاند ان کے سامنے ہوتا لیکن ہاتھ بڑھا کر اسے چھونے سے قاصر رہتیں۔

اجڑے، ویران، مایوس اور اندھیروں میں ڈوبی ہوئی گلیوں سے نکل کر شہر...... ہوٹل...... شہر کی سیر...... رات کے وقت چتو کی میٹھی میٹھی باتیں...... پولس کا چھاپہ...... ہوٹل سے ڈرامائی انداز میں نکلنا...... اس محل میں ان کی خواب ناک آمد...... شہزادیوں جیسی خاطر مدارات......

چاند کو انہوں نے چھو لیا اور چتو کا بخشا ہوا اعتماد کہ وہ کمد جیسی شوخ و شنگ تتلی سے یوں باتیں کر رہی ہیں۔

وہ اپنی کشتیاں جلا کر اس ساحل پر اتری ہیں۔ یہ ایک بھرا پرا بازار ہے اور چتو نے انہیں اچھی طرح بتا دیا ہے کہ وہ ہرگز خالی ہاتھ نہیں، ان کے پاس وہ سب کچھ ہے جن کا بازار میں ڈیمانڈ ہے۔

اچانک، شانت اور اندر اندر کھولتے ہوئے سمندر میں کمد ایک بڑی کنکری مارتی ہے۔

"بنّی کی آپ فکر مت کیجئے اور آپ بھی جب تک چاہیں، اطمینان سے رہیں، جانا چاہیں تو اس کا انتظام ہو جائے گا"۔

سمندر میں لہریں بننا شروع ہوئیں۔

ایک لہر......

اس کے اندر پھر دوسری لہر......

اس کے اندر پھر تیسری لہر......

لاتعداد وسیع لہریں بنتی گئیں اور پھیلتی گئیں۔

اس نے کمد کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کی...... اس کے لئے کسی مکتبی علم کی کیا ضرورت؟ اس کے چہرے پر جو کچھ لکھا ہے وہ صرف دو دونی چار ہے، اس سے آگے کچھ بھی نہیں......

اس کے کانوں میں ایک پراسرار نامعلوم سرگوشی ہوتی ہے۔

اندر کی جو بات بار بار اوپر آکر لوٹ رہی تھی، اچانک زبان پر ایک بھوکی بلی کی طرح کود پڑتی ہے۔

کمد بہت غور سے اس کی طرف دیکھتی ہے اور دھیرے سے پوچھتی ہے۔

''کن لوگوں نے......؟''

''جو اس دن چھپ کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔''

کمد تمسخر بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی ہے، عورت کے چہرے پر شفق رنگ جھلکنے لگا ہے۔

''کس نے کہا......؟ چتو نے......؟''

عورت اثبات میں سر ہلا دیتی ہے۔ کمد کے چہرے پر ایک عجیب بے رحم سپاٹ پن ابھر آتا ہے۔

''بالکل غلط کہا اس نے...... یہاں معاملہ انیس سے بیس کا ہوتا ہے تو بات ختم ہو جاتی ہے......اب اس نے کیا کہا بھائی، وہ جانے''۔

عورت اس کا منہ تکتی رہ جاتی ہے۔ ہوٹل کے آئینے میں اس نے جو کچھ پڑھا تھا، وہ سب بھولنے لگتی ہے۔ سبق بھولنے والے کو مسجد کے مولوی صاحب ہتھیلی پر چھڑی برساتے تھے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اس کی ہتھیلی پر زور زور سے چھڑیاں برسا رہا ہے۔

اور سبق بھولے گی......؟

اور سبق بھولے گی......؟

وہ بے تابی سے کھڑے ہو کر ٹہلنے لگتی ہے۔ کمد لاپروائی سے اسے دیکھتی رہتی ہے۔ ٹہلتے ٹہلتے رک کر وہ کہتی ہے:

''آخر چتو کو کیا پڑی تھی......؟''

''دیکھو بہن، تم ابھی نئی نئی آئی ہو۔ یہاں آدمی جب بھی ندی میں ڈبکی لگاتا ہے تو صرف دوسری طرف نکلنے کے لئے۔ ڈوبنے کے لئے یہاں کوئی ڈبکی نہیں لگاتا، یہ بات یاد رکھنا''۔

کمد کی باتیں وہ واقعی سمجھ نہیں پاتی اور سادگی سے کہتی ہے۔

''میں سمجھی نہیں......''

''یوں ہے کہ یہاں جب بھی آدمی اپنی زبان سے کوئی لفظ نکالتا ہے تو بلا مقصد نہیں۔ ایک چھوٹے سے لفظ کے ذریعے وہ اپنے مقصد کی تکمیل کا ڈول ڈالتا ہے ورنہ تم خود سوچو، تم میں اب کیا رکھا ہے؟''

اسے محسوس ہوتا ہے بھرے بازار میں اچانک اس کے جسم سے کپڑے کھینچ لئے گئے ہوں اور وہ ننگی ہو گئی ہو......

بالکل ننگی......

لاشعوری طور پر اس کے ہاتھ ستر پوشی کی کوششوں میں فوراً چل پڑتے ہیں۔ کمد کی تیز نگاہیں اسے اندر اندر پڑھ لیتی ہیں، وہ قدرے نرم لہجے میں اسے مخاطب کرتی ہے:

''میری بات کا برا مت ماننا، تم ایک اچھی عورت ہو، لیکن چتو نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح نہیں ہے، یہ میں تمہارے بھلے کو کہہ رہی ہوں''۔

وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتی ہے۔ اس کے اندر جو زبردست اتھل پتھل برپا ہے اس سے صرف وہی واقف ہے۔ اپنے چہرے کو بہت مشکلوں سے اس نے سپاٹ بنا رکھا ہے۔

کمد کے کان بہت تیز ہیں، وہ، وہ باتیں بھی سن لیتی ہے جو کہی نہیں جاتیں۔ وہ آگے کہتی ہے:

''......میری صاف صاف باتوں سے دل میلا مت کرنا، ہم پکا سودا کرتے ہیں، ہر بزنس کے کچھ اصول قاعدے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بچولیوں کا کوئی اہم کام نہیں ہے۔ چتو جیسے چھوٹے لوگ یہ کام کرتے ہیں لیکن اپنے رسک پر۔''

پتہ نہیں وہ کیا کہنا چاہتی ہے، آگے کیا کہے گی، اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔ نظر آرہا ہے تو بس یہ کہ وہ جس مسند پر بٹھائی گئی تھی اسے پیچھے سے کھینچ لیا گیا ہے۔ وہ جس دنیا سے آئی تھی، واپس وہیں ڈھکیل دی گئی ہے...... پہلے سے بھی بہت بدتر حالت میں۔

وہ ایک غیر محسوس جسم اور روح لے کر آئی تھی، اس کے جسم اور روح پر زخموں کے نظر نہیں آنے والے نشانات تھے، اس کے لئے دن کیا اور رات کیا۔ اب جب کہ وہ واپس ڈھکیل دی گئی ہے تو اس کی روح بھی چور ہے اور جسم بھی۔ اس کے لئے دن اور رات اب الگ الگ معنی رکھتے ہیں۔

رات......اتھاہ تاریک......

اور دن......دھوپ کی تپش سے بھرپور......

وہ بہت دیر تک کچھ سوچتی رہتی ہے۔ کمد جا چکی ہے۔ لڑکی نیند کی پراسرار راہوں میں کھوئی ہے۔ اس کے سارے اعضا حسب معمول الگ الگ ہو کر مستعدی سے کھڑے پہرہ دے

رہے ہیں۔لڑکی اپنے آپ سے بالکل بے خبر ہے اور اس طرح کھوئی ہوئی ہے کہ اس پر کوئی ڈاکا بھی ڈال دے تو اسے کچھ پتہ نہ چلے...... خود کہیں، کپڑے کہیں، ہوش کہیں، حواس کہیں......

لڑکی سے اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے، گاؤں کے رشتے سے وہ اسے بوا کہتی ہے۔خالہ بھی کہہ سکتی تھی، چچی اور ممانی بھی...... یہاں ہر ایک یہی جانتا ہے کہ وہ اس کے بھائی کی بیٹی ہے...... مضبوط رشتہ......

یہ ایک طرح دونوں کے لئے ایک محفوظ پناہ گاہ ہے۔ایک ایسا دبیز پردہ جس کے پیچھے بہت کچھ پوشیدہ ہے۔

وہ اسی بستر پر لیٹ جاتی ہے، نیند کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں، لڑکی کے گلے سے جو ہلکی ہلکی خرخراہٹ سی نکل رہی ہے، وہ بھی اسے کم پریشان نہیں کر رہی۔وہ کچھ سوچنا چاہتی ہے لیکن سوچ نہیں پاتی۔وہ کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتی ہے لیکن پہنچ نہیں پاتی۔رات دھیرے دھیرے بہہ رہی ہے۔

چاروں طرف اتھاہ خاموشی اور گہرا سناٹا...... ایک سوئی بھی گر جائے تو اس کی آواز بھی سنائی دے جائے۔

سناٹے کی اس حکمرانی میں اسے بس دو ہی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔اس کے دل کی دھڑکن......

نیند میں کھوئی لڑکی کے بدن کی تھرکن......

ان دونوں کے درمیان وہ کوئی نئی بات سوچنے کی کوشش کرتی ہے۔

نئی بات......

یا پرانی بات......

وہ اپنے آپ کو ایک پنڈولم کی مانند چھوڑ دیتی ہے۔

بہت سی باتیں...... بڑی بڑی باتیں اکثر چھوٹی باتوں سے جنم لیتی ہیں، لیکن چھوٹی بات سے بڑی بات پیدا کرنا...... شاید بہت ہمت کا کام ہے۔

وہ فیصلہ نہیں کر پاتی ہے کہ وہ ایک باہمت اور اعتماد سے بھری ہوئی عورت ہے یا ایک کمزور، مسترد عورت؟

یا ان دونوں کے درمیان کی کوئی چیز؟

ہر گھنٹے پر کسی گھنٹہ گھر سے آواز آتی ہے جس سے نہ صرف وقت کا اعلان ہوتا ہے بلکہ اس کی سوچ میں بھی رخنہ پڑتا ہے۔

انہیں گھنٹوں کی گنتی سے پتہ چلتا ہے کہ رات اب بس تھوڑی سی رہ گئی ہے اور اگلا گھنٹہ شاید صبح کی خبر ہی لے کر آنے والا ہے۔

اچانک ایک تیر سا اس کے دماغ میں گھستا ہے، ایک بجلی دوڑ جاتی ہے اس کے اندر...... وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور آہستہ سے لڑکی کو ہلاتی ہے۔

لڑکی کسمسا کر رہ جاتی ہے۔

وہ اس کے کان میں منمناتی ہے۔

''جلدی اٹھو بنّی ......ہم بڑی مصیبت میں پڑ گئے ہیں''۔

مصیبت کا سن کر لڑکی نہ صرف آنکھیں کھول دیتی ہے بلکہ فوراً اٹھ بیٹھتی ہے اور حیران نظروں سے عورت کو دیکھتی ہے۔

''کیا ہوا بوا......؟''

عورت ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہے اور اس کے کان میں بہت دھیرے سے کہتی ہے۔

''ہم بہت غلط جگہ پھنس گئے ہیں بنّی، یہ لوگ لڑکی کا دھندا کرتے ہیں''۔

لڑکی کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل جاتی ہیں، وہ جلدی سے پوچھتی ہے:

''لیکن یہاں تو چنو نے......''

''اس بچارے کو کیا پتہ......اس نے تو اپنے جانتے ہماری بھلائی ہی کی بات سوچی ہوگی، لیکن یہاں تو......''

لڑکی کا چہرہ پیلا پڑ جاتا ہے۔ وہ کتنی مطمئن سوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہے، کیا کرے۔ سب کچھ تو بوا نے کیا ہے ابھی تک......وہی اس مسئلے کا حل بھی نکالیں گی......

یہ سوچ کر اسے قدرے اطمینان ہوتا ہے کہ اسے کچھ نہیں کرنا۔

عورت کہتی ہے:

''یہاں سے فوراً نکل جانا ہوگا، ابھی اور اسی وقت، بہت ہوشیاری سے، ان لوگوں کو

بھنک مل گئی تو کتوں سے نچوا دیں گے''۔

پوچھ تاچھ کا زیادہ موقع نہیں۔ لڑکی نے یوں بھی اپنے آپ کو عورت کے حوالہ کر رکھا ہے۔ عورت ٹہلتی ہوئی، لڑکی کے ساتھ آہنی گیٹ تک آتی ہے، پھر روش کی طرف مڑ جاتی ہے، پھر گیٹ تک، پھر......

مستعد پہرے داروں نے پہلی بار مشتبہ انداز میں چونک کر ان کی طرف دیکھا، دوسری بار ان کا شبہ کم ہو جاتا ہے۔

تیسری بار اور کم......

چوتھی بار......

وہ بالکل بے خیالی کے اسٹائل میں ٹہلتی ہوئی گیٹ سے باہر نکلتی ہیں۔ پہرے داروں نے ان پر سوالیہ نگاہیں ڈالی ہی ہیں کہ عورت مسکرا کر کہتی ہے:

''صبح میں لمبی سیر کی عادت ہے نا...... اندر جی نہیں بھر رہا......''

''زیادہ دور نہ جانا...... یہاں کے راستے بڑے بے وفا ہیں، جانے کب دھوکا دے جائیں......''

ایک پہرہ دار ہنس کر کہتا ہے۔

عورت مسکراتی ہے اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس قیمتی لمحے سے فائدہ اٹھاتی ہے اس احتیاط کے ساتھ کہ قدم کی تیزی نگاہوں کی گرفت میں نہ آسکے۔

دس قدم......

پندرہ قدم......

بیس قدم...... وہ اسی انداز میں چلتی ہیں، آہستہ آہستہ اس میں تیزی آجاتی ہے...... آتی چلی جاتی ہے......

سڑک سے دوسری طرف مڑتے ہی وہ دوڑنے لگتی ہیں، خوب تیز......

دوڑتے، دوڑتے......

دوڑتے، دوڑتے......

✠ • ✠ • ✠

نجات

سارے بچے میدان میں کبڈی کھیل رہے ہیں۔ان میں میرے تین بھائی بھی شامل ہیں۔بارہ سے پندرہ سال کے بچوں کا گروپ ہے۔ان کے جسم پر ہاف پینٹ ہیں یا انڈر ویئر یا چڈی...... سب کے بدن پر بھوری مٹی ملی ہوئی ہے۔ان کے بدن کندن کی طرح دمک رہے ہیں۔وہ آپس میں یوں گتھم گتھا ہیں کہ خوف سا محسوس ہوتا ہے۔نام نہاد ستر پوشی کے باوجود سب ننگے ہی دکھائی دیتے ہیں...... پتلی کمر، بھری بھری پیٹھ، اور بازوؤں میں اچھلتی ہوئی زندہ مچھلیاں...... کسی کسی کے چہرے پر سبزۂ آغاز ہے، زیادہ تر کے چہرے بالکل صاف ہیں۔ایک آدھ کی ٹھڈی پر بھورے، نرم مخملی بال بھی نکل آئے ہیں۔ابھی کہیں پر استرا نہیں پھیرا گیا ہے۔ اصل جو چیز ان کے پاس ہے وہ ہے ان کی رانیں...... سڈول، چکنی، تھرتھراتی، نوجوانی کی لہروں سے بھرپور...... انہوں نے اپنی تشفی کے لئے ستر پوشی کا کچھ نہ کچھ انتظام کر رکھا ہے لیکن جہاں جہاں یہ انتظام نہیں ہے، وہاں آنکھیں ٹھہر نہیں پاتیں...... آنکھوں کے ٹھہر جانے کا مطلب ہے ان کا لگ بھگ ننگا دکھائی دینا...... اس کے بعد کیا ہوگا......؟

میں دیوار کے پیچھے چھپ کر ان کا کھیل دیکھتی رہتی ہوں۔میرے بھائی قریب جانے کی مجھے اجازت نہیں دیتے...... کیوں؟

ننگا دکھائی دینا اس کی ایک وجہ ہے تو وہ گھر میں اس سے بھی بدتر حالت میں رہتے ہیں، نہ صرف میری بلکہ میری تین بہنوں کی آنکھوں کے سامنے بھی۔دو بہنیں مجھ سے بڑی ہیں، دو بھائیوں سے بھی بڑی، وہ انہیں دیکھ کر کیا محسوس کرتی ہیں، میں نہیں جانتی، صحیح معنوں میں جانتی تو میں بھی نہیں ہوں۔بس یہ ہے کہ ان کے جسم کے بے ہنگم حصوں پر جب بھی میری نگاہیں پڑتی ہیں

تو پھر وہیں کی وہیں ٹھہری رہتی ہیں، وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ بڑی باجی شاید یہ چیز محسوس کر چکی ہیں، کبھی کبھی وہ کچھ کہے سنے بغیر میرے گال پر ایک ہلکی سی چپت لگا کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ ان کی یہ سرزنش میری برہنہ نگاہوں تک فوراً پہنچ جاتی ہے اور میں شرمندہ ہو کر جلدی سے اپنی نگاہیں ہٹا لیتی ہوں، دل و دماغ کے اندر کوئی چیز البتہ کھولتی رہتی ہے۔

بڑی باجی کو میں نے ایک بار نہیں، دو بار نہیں بلکہ بہت بار کسی نہ کسی بھائی کی سوتی حالت میں بے ستری کو چادر یا لنگی سے ستر پوشی کرتے دیکھا ہے۔ باجی سمجھتی ہیں کہ ایسا کرتے ہوئے انہیں کوئی نہیں دیکھتا، وہ جیسے اس مہم پر جتی رہتی ہیں۔ جہاں انہوں نے کسی بھائی کو بے ہنگم انداز میں دیکھا، تیزی سے آ کر فوراً کپڑے ڈال دیں گی، پھر چور نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی بھی ہیں۔ شکر ہے ابھی تک انہوں نے مجھے نہیں دیکھا اور دیکھیں بھی کیسے......؟ میں تو اس وقت یوں بن جاتی ہوں کہ یا تو میں بہت گہری نیند میں ہوں یا پھر میری آنکھیں یوں بند ہیں کہ میں کچھ دیکھ ہی نہیں رہی۔ اگر میں چادر سے منہ ڈھانپ لیتی ہوں تب تو میں بالکل ہی محفوظ ہوں۔ باجی کو کیا پتہ کہ کثرت استعمال سے میری چادر کتنی پتلی اور ہلکی ہو گئی ہے۔ اس میں کچھ ایسے چھید بھی ہیں جنہیں ایک خاص حکمت سے استعمال کیا جائے تو آدمی سب کچھ دیکھتا رہے، وہ سب کی نظروں سے چھپا رہے لیکن اس کی نظروں سے کوئی چھپ نہ سکے۔ میری بوسیدہ چادر مجھے اس قدر محبوب ہے کہ میں اسے پھینکنے کی بات سوچ بھی نہیں سکتی، اماں سے جمپر، شلوار، دوپٹے اور چپل وغیرہ کے پھٹ جانے یا ٹوٹ جانے کی شکایت کرتی ہوں، چادر کی شکایت کبھی نہیں کرتی۔ یوں شکایت کرنے سے شلوار، جمپر آ تھوڑی جاتے ہیں، بس اماں کے کانوں سے سفر کرتی ہوئی شکایت ابا کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے...... یعنی صحیح جگہ پر، اس پر عمل کتنا ہوتا ہے، یہ ایک الگ بات ہے۔ ابا کو بھی تو اپنے چھ چھ بچوں کے بارے میں سوچنا ہے، سبھی کے کپڑے لتے۔ پھر اماں کے، پھر...... اُن کے کپڑے تو اس قدر بوسیدہ اور پرانے ہوتے ہیں کہ دیکھنے والے کو شرمندگی ہوتی ہے، اسی عالم میں وہ کام پر بھی جاتے ہیں، شادی بیاہ میں بھی، ہاٹ بازار بھی...... وہ کیسے بے حس ہیں کہ بھائی بدن پر اچھے کپڑے نہیں تو پروگرام ملتوی کر دو، لیکن نہیں...... ہر جگہ جانا بھی ضروری اور ہر فرض کی تکمیل بھی مقدم...... کام پر جانے کی حد تک تو واجب ہے کہ وہ نہ جائیں تو آخر کون جائے، لیکن ہر جگہ رسم نبھا کر انہیں کیا ملتا ہے؟ کوئی پوچھتا تو ہے نہیں، سو پچاس آدمی جہاں کھانے پر بیٹھ گئے تو یہ بھی بیٹھ گئے اور پھر اتنا بھی

نہیں کہ پلاؤ کھایا ہے تو صابن یا مٹی سے ہاتھ بھی دھولیں...... آدھا گلاس پانی پی کر آدھے پانی سے ہاتھ دھولیں گے، نہ چکنائی جاتی ہے نہ بو...... کالے بالوں سے بھرے ہاتھ میں جگہ جگہ گھی چمکتا دکھائی دیتا رہتا ہے، یہی حال مونچھوں اور ہونٹ کا رہتا ہے۔ اسی بھیگے ہاتھ سے اطمینان سے بیڑی سلگا لیں گے اور بڑی بے فکری سے پھونکتے ہوئے گھر آ جائیں گے۔

اماں کہتی ہیں وہ ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں گندے، لاپرواہ اور اس سے بالکل بے فکر کہ دوسرے ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ اُنہیں دلچسپی ہے تو ایک بات سے...... اس دلچسپی نے تو ان کی زندگی کو جہنم بنا ڈالا ہے، لیکن اُنہیں کچھ پتہ ہی نہیں۔

ہمارا گھر بھی بڑا ہوتا...... شیخ دادا کی طرح...... بہت سے کمرے ہوتے، ہر ایک کے لئے سونے کا الگ کمرہ، کھانے کا الگ کمرہ، عورتوں اور مردوں کے ملنے کے الگ کمرے، بہت بڑا باورچی خانہ اور پورے مکان میں اتنے غسل خانے کہ جب ان کی پوتی کی شادی ہوئی تھی تو بیت الخلاء کی ایک دم تکلیف نہیں ہوئی، جب ضرورت ہو، سامنے والے غسل خانے میں گھس جاؤ، کیا مجال جو کہیں گندگی نظر آ جائے، ہلکی سی بو بھی نہیں آتی۔ کم از کم آدھا غسل خانہ بھی ایسا اپنے گھر میں ہوتا، لیکن میں کیا کر سکتی ہوں، سب کچھ تو ابّا کرتے ہیں اور ان کو کچھ کرنے کا شوق ہی نہیں۔

شیخ دادا کے بیٹے، بیٹیاں، بہو، داماد، داماد کے داماد، پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں وغیرہ ایک ساتھ آ جاتے تب بھی انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اتنے کمرے ہیں ان کے ہاں...... اتنے تو بچّے بھی نہیں ہیں سب کے۔ اور یہاں......

یہاں تو سب کچھ بس ایک ہی کمرے میں ہوا ہے اور آگے بھی سب کچھ یہیں ہونا ہے۔ امّاں ابّا کو تو زیادہ سے زیادہ بس ایک بچّہ پیدا کرنا چاہئے تھا۔ حالانکہ ایک بچّہ کے لئے بھی ان کے پاس جگہ نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے تو کمال ہی کر دکھایا۔ ایک بچّے کی آنکھوں کے سامنے دوسرا بچّہ...... پھر تیسرا بچّہ...... یہاں تک کہ چھٹا...... اگر وہ نرس سب کے سامنے ابّا کو پھٹکار نہیں لگاتی اور صاف صاف منہ پر نہیں کہہ دیتی کہ تمہاری بیوی کی بچّہ دانی کمزور ہے، آگے بچّہ ہوا تو بیوی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے تو شاید یہ سلسلہ ابھی چلتا ہی رہتا۔ ابّا ہفتوں یوں منہ لٹکائے پھرے جیسے کوئی موت ہو گئی ہو اور اس وقت ان کے چہرے پر زندگی لوٹی جب نرس نے انہیں امّاں کا آپریشن کرا دینے کا مشورہ دیا۔ پہلے جب اس نے انہیں اپنا ہی آپریشن کرانے کو کہا تھا تو وہ ایسا چپ ہوئے تھے

جیسے اب کبھی بولیں گے ہی نہیں۔

لبا اس کی بات سن کر چپ کیوں ہوئے تھے......؟

کیا سوچا تھا انہوں نے......؟

آگے کا کون سا نقشہ تھا ان کے پاس......؟

ان کی اس چپ پر سوچ کے آج بھی ہنسی آتی ہے۔ مان لو اماں بچہ پیدا کرنے کے قابل ہی نہ رہتیں، یا وہ لبا کے لائق نہ رہتیں یا وہ انتقال ہی فرما جاتیں تب......؟

تب لبا کیا کرتے......؟

دوسری عورت لے آتے......؟

اسی روکھی سوکھی روٹی اور پھٹے پرانے کپڑوں پر......؟

اس پر سے یہ چھ چھ بچے......یعنی ہم سب......یعنی دھرتی کے بوجھ......یہ کوئی اور نہیں ہم ہی اپنے بارے میں کہتے ہیں اور روز کہتے ہیں، اماں تو ہمیں کچھ اور ہی سمجھتی ہیں، وہ جب بھی دھرتی کے بوجھ والی بات سنتی ہیں، نہایت بے دردی سے ہمیں دو ہتھڑوں سے نوازتی ہیں۔

''اللہ کی نعمت کو دھرتی کا بوجھ......؟ ارے کفر ہے سراسر کفر، پتہ نہیں تم لوگوں کا کیا حشر ہوگا......؟ ارے اس کے دل سے پوچھ، جس کے پاس سب کچھ ہے، نہیں ہے تو ایک اولاد......کلو چچا، دھولو ماموں، اکبر ماموں کو دیکھو......؟؟

''اور شمس الدین دادا، اختر چچا، متو ماموں کس بات پر شکریہ ادا کریں اماں؟'' ہم تمسخر کے ساتھ پوچھتے۔ ان بزرگوں کو اوپر والے نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ درجن درجن بھر چشم و چراغ عطا فرمائے ہیں۔ اماں فوراً کہتی ہیں۔

''یہ تو اس کی مرضی ہے کہ اس نے ہمیں صرف چھ ہی دیئے......''

اب اماں کو کیا کہیں، کوئی سخت بات تو کہہ نہیں سکتے۔ ماں ہیں اور ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ لیکن بات صاف یہ ہے کہ وہ ہیں بہت ذلیل......لبا ان سے سیدھے منہ بات نہ بھی کریں، اپنی آنکھوں سے انہیں روکھی سوکھی، بچا کھچا کھاتے ہوئے دیکھتے رہیں۔ پھٹی پرانی ساڑی رنگ برنگے پیوند لگا کر انہیں پہنتے ہوئے دیکھتے رہیں، بیمار ہو جائیں تو محض اللہ کی قدرت سے انہیں ٹھیک ہو جانے کے لئے چھوڑ دیں، پھر بھی لبا کے اک ذرا سے اشارے پر وہ

یوں دوڑی چلی جائیں گی جیسے...... جیسے......

لبّا بھی ایک عجیب وغریب ہستی ہیں، گھر کے باہر بھیگی بلّی، گھر کے اندر ببّر شیر، اپنے بچّوں کے ساتھ ان کا کبھی محبت کا رابطہ قائم ہی نہیں ہوا، ہماری ضروریات پر کبھی ان کی نگاہیں پڑتی ہی نہیں۔ پچاس ساٹھ بار لماں کہتی ہیں تو جھٹکے میں شاید کوئی چیز آ گئی تو آ گئی...... باتیں بہت ہیں اوران میں کسی نئی بات کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا، ہر چوبیس گھنٹہ انہیں باتوں کو دہراتا رہتا ہے۔

اگلا چوبیس گھنٹہ بھی......

اس سے اگلا چوبیس گھنٹہ بھی......

اماّں...... اماّں تو وہ ہیں جو، لبّا کے حکم کے ننانوے حصے پر عمل کرتے ہوئے اپنی جان بھی دے سکتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیں سویرے سو جانے کی تلقین کرتی ہیں۔ لبّا سویرے کبھی گھر نہیں آتے، زیادہ تر اس وقت آتے ہیں جب ہم سب سو چکے ہوتے ہیں یا سوئے جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ سونے یا سونے کی ایکٹنگ کرنا ہمارا، ایک بہت بڑا احربہ ہے۔ لبّا کے گھر آنے کے بعد ان کی ساری حرکتیں اور سارے معمولات ہماری نگاہوں اور ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ لماں لبّا کو اس بات کی ذرا بھنک مل جائے تو پتہ نہیں وہ ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کریں......؟

لبّا کو اس کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ ہمارے سونے کی تصدیق ہی کر لیں، انہیں تو بس...... ہاں، اماں ضرور بار بار تصدیق کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور ہم بھی ہر بار ان کی تشفّی کر دیتے ہیں، حالانکہ ہم صحیح معنوں میں اسی وقت سوتے ہیں جب تھکن سے چور لماں اور لبّا کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگیں۔ ہمیں تو انہیں خراٹوں میں نیند آتی ہے۔

ایک بار باجی نے ہمیں جاگتا دیکھ لیا تو انہوں نے گویا نیند کی بے خیالی میں بڑے زور کا ہاتھ میرے منہ پر دے مارا تھا، میں تلملا کر رہ گئی، بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا تو شاید وہ بھی ایکٹنگ کرتی ہوئی بڑے مزے سے سو رہی تھیں، چہرے پر سکون اور ہونٹوں پر نیند کی مسکان لئے ہوئے......

کمرہ ایک ہی ہے اور اس کے فرش پر ہم سب بھائی بہنوں کے بستر ہوتے ہیں، کنارے ایک چوکی لبّا کی ہے۔ اماں لیٹتی تو ہیں ہمارے ساتھ لیکن لبّا کے اشارے پر کسی وقت اوپر چلی جاتی ہیں اور......

توبہ توبہ...... گناہ قصور اللہ معاف کرے......

لالٹین بجھی رہتی ہے اور کمرے میں گویا مکمل تاریکی چھائی رہتی ہے لیکن ایسے مواقع پر ایک ایسی آنکھ ضرور کھل جاتی ہے جس سے سب کچھ دکھائی دینے لگتا ہے۔

کمرے میں چوکی نہ بچھی ہوتی اور ابا بھی ہم سب کی طرح فرش ہی پر سوتے تو شاید ہمیں اتنی آسانی نصیب بھی نہ ہوتی۔

باجی سے مار کھانے کے بعد صبح مجھے یہ فکر ستاتی رہی کہ کہیں سچ مچ انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے نہ دیکھ لیا ہو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ نیند میں ہاتھ پاؤں نہیں چلاتیں۔ دن بھر چور نگاہوں سے میں کچھ پڑھنے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ بھی یوں مگن رہیں جیسے انہیں ہماری یا کسی اور کی کوئی خبر ہی نہ ہو۔ میرے دل میں بھی کبھی کبھی اطمینان کی لہریں موج مارنے لگیں کہ شاید میری چوری پکڑی نہیں گئی۔

باجی سب کام سے فارغ ہو کر اپنے رنگے دوپٹے کو دھوپ دکھانے چھت پر گئیں تو بالکل بے ارادہ اور اچانک میں بھی ان کے ساتھ اوپر چلی گئی اور ایک دوپٹہ ان کے ہاتھوں سے لے کر اس کا پانی جھٹکنے لگی تبھی باجی نے دھیرے سے پوچھا۔

''بہت دنوں سے دیکھ رہی ہو......؟''

ایک دم بچھو نے، جیسے مجھے ڈنک مار دیا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے، زبان سوکھ گئی، دوپٹہ میرے ہاتھوں میں لرزنے لگا، اس سے پہلے کہ وہ زمین پر گر جائے، باجی نے اسے لے لیا اور آہستہ سے بولیں۔

''گندی بات ہے بنو...... یوں بڑوں کو نہیں دیکھا کرتے، نگاہ پڑ جائے تو آنکھیں بند کر لے یا دوسری طرف کروٹ بدل لے......''۔

باجی کی ہمدردانہ گفتگو سے حواس کچھ ٹھکانے آئے۔ میں نے اپنے دوپٹے سے پیشانی، چہرہ اور گردن کے پسینے صاف کئے اور ممنون نگاہوں سے باجی کی طرف دیکھا۔ میری رازدار بن کر اچانک وہ میرے، بہت قریب آ گئیں۔ میں نے آہستہ سے دریافت کیا۔

''آپ نے کبھی دیکھا ہے باجی......؟؟''

باجی نے اپنے دونوں گالوں پر ہلکے ہلکے تھپڑ رسید کئے اور دونوں ہاتھوں کو گویا خدا کے حضور میں جوڑتی ہوئی بولیں۔

''توبہ استغفار...... میں تو ہمیشہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہوں یا کروٹ بدل لیتی ہوں، خدا گناہ سے ہمیں دور رکھے......''۔

باجی کا چہرہ کسی نامعلوم وجہ سے تمتما اٹھا ہے، اوپری ہونٹ پر ننھے ننھے پسینے لرز اٹھے ہیں۔ درمیان کا پردہ اچانک اٹھ جانے کے بعد وہ جیسے ہماری صف میں آ گئی ہیں، یوں وہ مجھ سے کافی بڑی ہیں۔ میں دریافت کرتی ہوں۔

''یہ سب گناہ کا کام ہے باجی......؟''

اس سوال پر باجی ایک دم سے گھبرا جاتی ہیں اور کچھ سوچ کر کہتی ہیں۔ ''ابھی تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی بنو...... ابھی تم بہت بچّی ہو نا، بڑی ہو جاؤ گی تو خود بہ خود یہ باتیں تمہاری سمجھ میں آ جائیں گی......''۔

باجی کیا کہہ رہی ہیں......؟

وہ کیا کہنا چاہ رہی ہیں......؟

ان کا خیال ہے کہ دس گیارہ سال کی ہو کر بھی شاید میں بالکل بے عقل ہوں اور جو چیز میں اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہوں، وہ چیز میرے اندر نہیں اترتی۔ چپ چاپ میرے سامنے سے گزر جاتی ہے۔

کمال ہے باجی کا...... پندرہ سولہ سال کی عمر میں وہ تیس سال کی عقل رکھ سکتی ہیں، میں دس گیارہ سال کی عمر میں پندرہ سال کی عقل نہیں رکھ سکتی......!

ان کا کہنا صحیح ہے تو پھر میری عمر کے لوگوں کو میٹھی چیز، میٹھی نہیں لگنی چاہئے، تلخ چیز تلخ نہیں، ٹھنڈا ٹھنڈا نہیں، گرم گرم نہیں...... میرے جسم اور سینے پر جو ایک عجیب سی سرسراہٹ ہوتی رہتی ہے...... وہ کیا چیز ہے......؟

باجی سمجھتی ہیں کہ شاید میں نے پہلی بار یہ سب دیکھا ہے۔ ارے یہی دیکھتے دیکھتے تو میں پندرہ سال کی...... نہیں نہیں، پندرہ سال کی تو خود باجی ہیں، میں تو شاید دس مکمل کر کے گیارہویں میں چل رہی ہوں لیکن میں نے کیا نہیں دیکھا ہے اتنی عمر میں...... میری آنکھیں تو تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو چکی ہیں۔

میں نے کس کو بے ستر نہیں دیکھا......؟

باجی نہیں جانتیں کہ ہمارے سبھی بھائی کیسی مدہوشی کی نیند سوتے ہیں؟ انہیں اپنی کوئی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ باجی دیکھتی ہیں تو اپنے بڑے پن کا فائدہ اٹھاتی ہوئی ان پر کپڑے ڈال دیتی ہیں...... میں کیا کروں......؟

میں تو بہت چھوٹی ہوں، میں تو ان پر کپڑے ڈالنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی۔ میں تو ان کے نزدیک بھی نہیں جاتی۔ اس عالم میں انہیں دیکھنا مجھے کچھ اچھا تھوڑی لگتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں ایک دم سے گھبرا جاتی ہوں، سارے بدن میں تھرتھری سی ہونے لگتی ہے اور پسینے نکلنے لگتے ہیں، غنیمت ہے کہ میری اس کیفیت کو کسی نے محسوس نہیں کیا۔ البتہ دوسری بار...... تیسری بار...... بہت بار دیکھنے پر مجھے ایک میٹھا میٹھا سا درد ضرور محسوس ہونے لگا ہے، اس کا مجھے اعتراف ہے۔ میری نگاہیں اب ادھر سے ہٹتی ہی نہیں، جی میں آتا ہے بس دیکھتی ہی رہوں، حالانکہ ایسا کرنا کتنا مشکل ہے۔ چھوٹا سا تو گھر ہے، آدمیوں سے ٹھسم ٹھس بھرا ہوا، سب کی نگاہیں بار بار ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں، آخر یہ نگاہیں جائیں بھی تو کہاں؟ گھوم پھر کر تو انہیں آپس میں ہی ٹکرانا ہے۔ ایسی صورت میں اس چیز کو دیکھنا جس کے لئے دماغ بار بار کہے کہ غلط ہے اور دل دیکھنے پر مجبور کرے......کوئی آسان ہے کیا......؟

بھائیوں کو اتنی تمیز ہی نہیں کہ جب اتنے چھوٹے گھر ہی میں مرنا جینا ہے تو ذرا قاعدے سے رہیں۔ کیا ضروری ہے کہ ایسے ہی کپڑے پہن کر سوئیں جن سے ان کا سب کچھ نظر آتا رہے۔

اور صرف بھائی ہی کیوں، ابا کون سے ستھرے ہیں......؟

میری سہیلی گڑیا کتنی بار بتا چکی ہے کہ عورت مرد کا ایک دوسرے سے ملنا بلکہ سٹنا بہت ضروری ہے، اس کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، وہ تو یہ بھی کہتی ہے کہ وہ اور اس کے بھائی بہن آپس میں میاں بیوی کا کھیل کھیلتے ہیں، اس کے ماں باپ سویرے ہی کام پر چلے جاتے ہیں، رات میں لوٹتے ہیں۔ وہاں بھی گھر ایک ہی کمرے میں سمٹا ہوا ہے اور ان لوگوں کو بغیر کسی خوف وخطر کے یہ کھیل کھیلنے کا پورا موقع ملتا ہے۔ ہمارے ابا بھی صبح کام پر چلے جاتے ہیں پر اماں تو رہتی ہی ہیں۔ اس لئے ہم تو یہ کھیل کھیل ہی نہیں سکتے۔ یوں بھی ہم بھائی بہنوں میں اتنی قربت نہیں کہ ہم آپس میں کوئی کھیل بھی کھیلیں۔ بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ، بہنیں اپنی سہیلیوں کے ساتھ......

میرے بھائی کا ایک دوست ہمیشہ اس کی غیر موجودگی میں اسے ڈھونڈنے آتا ہے، وہ

مجھے بہت گھور گھور کر دیکھتا ہے۔ایک بار آیا تو گھر میں کوئی نہیں تھا۔اس نے زبردستی مجھے لپٹا لیا اور میرے کولہے، پیٹھ اور سینے پر اس قدر ہاتھ پھیرے کہ میرے پورے جسم میں چنگاریاں سی بھر گئیں اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ ان چنگاریوں کی تپش مجھے جلا کر مار دے گی...... میں کسی طرح اپنے آپ کو چھڑا کر نکل بھاگی۔

میرے جسم میں آخر وہ کیا ڈھونڈ رہا تھا؟

ملا تو کچھ ہے نہیں۔ میرے پورے جسم میں چنگاریاں بھر دیں جو بعد میں سرسراتی چیونٹیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ میں فوراً نہانے بیٹھ گئی۔ پتہ نہیں اس نے کیا کیا تھا کہ بہت دیر تک نہانے کے بعد بھی چیونٹیاں میرے جسم پر رینگتی رہیں۔ مجھ پر ایک وحشت سی طاری ہوگئی، اس دن میں نے کچھ کھایا بھی نہیں، اسی طرح سوگئی، اماں اور باجی نے بہت کہا کہ دو نوالے کھا لو، رات میں نہیں کھانے سے چڑیا بھر گوشت گھٹ جاتا ہے، لیکن میں کیا کرتی، چڑیا بھر گوشت گھٹے یا مرغی بھر...... رات بھر چیونٹیاں سرسراتی رہیں۔ نہ اس کروٹ چین، نہ اس کروٹ چین۔ اس رات اماں ابا کو بھی نیند آگئی ورنہ شاید چیونٹیوں کے بھاگنے کی کوئی صورت نکل آتی۔

ساری رات کروٹ بدلتے گزر گئی۔صبح باجی نے میری آنکھیں سرخ دیکھیں تو گھبرا کر میرا ماتھا ٹٹولنے لگیں۔

''ہائے اللہ...... اس کو تو تیز بخار ہے...... اماں......''

اماں دوڑی آئیں۔ ابا اطمینان سے بیڑی پھونکتے رہے، اماں اور باجی پوری تفتیش کے ساتھ میرے پاس سے لوٹیں تب انہوں نے بہت لاپروائی سے پوچھا۔

''کیا ہوا ہے؟''

کئی روز تک ذہن میں وحشت کے کیڑے کلبلاتے رہے۔ایک دن بلکہ ایک لمحہ کے لئے کچھ ہو جانے پر تو میری یہ حالت ہوگئی، اماں بیچاری تو روز ہی......

ان کا کیا حال ہوتا ہوگا؟

ان کے جسم میں تو ہزاروں، لاکھوں چیونٹیاں سرسراتی ہوں گی، بلکہ انہوں نے تو ان کے جسم میں اپنا مستقل گھر ہی بنا لیا ہوگا، اتنی چیونٹیاں انہیں روز کاٹتی ہوں گی، ان کا خون پیتی ہوں گی......انہیں نیند کیسے آتی ہے......؟

کس قدر تکلیف میں ہیں میری اماں بچاری......؟

میں انہیں ہمدردی بھری نظروں سے تکتی رہی۔ کس جگرے کی بنی ہیں میری اماں......
دن بھر کولھو کے بیل کی طرح جتی رہتی ہیں، کیا مجال جو ایک لمحہ کے لئے بھی آرام کر لیں۔ جھاڑو، بہارو، برتن، مانجھن، کھانا پینا......

پھر محلّے ٹولے کے درجنوں کپڑے لے کر مشین پر بیٹھنا......

رات میں ابّا کے اشارے پر ان کی چوکی پر چلی جانا......

پھر رات بھر چیونٹیوں سے اپنے بدن کو کٹوانا......

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اماں کی کس طرح مدد کروں......؟

دو تین روز میں بخار تو اتر گیا، چیونٹیوں کی سرسراہٹ بھی ختم ہوئی لیکن اس کی کسک باقی رہی۔ ذہن میں سرسراہٹ چپک سی گئی۔ کبھی کبھی اچانک محسوس ہوتا کہ چیونٹیاں سرسرا رہی ہیں، اس احساس سے ایک عجیب نشے کی کیفیت طاری رہنے لگی۔

نشہ......

شاید......نشہ اسی کو کہتے ہیں۔

ابّا کو بیڑی پیتے دیکھ کر اس کے دھوئیں سے ہی مجھے نفرت سی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ایک پتلی سی گچھی میں آگ لگا کر سڑ سڑ کھینچ رہے ہیں، منہ ناک سے دھواں نکل رہا ہے......
یہی نشہ ہے......؟ جس چیز میں میٹھا میٹھا درد ہو، جس کے لئے ایک تڑپ سی محسوس ہو، جس کو پانے کے لئے بار بار دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہو......

ابّا کو بیڑی کے لئے یہی سب کچھ لگتا ہوگا نا......؟

اس دن بڑے بھیا نے کسی بات پر ناراض ہو کر میری کمر پر ایک دھول جما دیا تو اس وقت اچانک چوٹ سے میں بوکھلا گئی تھی لیکن آگے جا کر اس چوٹ نے میٹھے میٹھے درد کی شکل اختیار کر لی اور لگ بھگ ویسا ہی محسوس ہونے لگا جیسے چیونٹیاں......جیسے بھائی کا دوست......

بھائی کے دوست کے لپٹنے اور کمر پر بھائی کے مکّے کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بھائی کے دوست کا ایک عجیب سا انتظار مجھے رہنے لگا اور یہ خواہش سر اٹھانے لگی کہ بھیا پھر میری کمر پر ایک زوردار مکّا لگاتے......

زیادہ تر گھروں میں بیت الخلاء نہیں ہے۔ سورج کے کالے ہو جانے اور رات کے کالے سمندر میں ڈوب جانے کے بعد عورتوں کے جھنڈ، جھاڑیوں کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ گاؤں کے راستے اور جھاڑیاں...... رات کی تاریکی میں دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں، البتہ دن کی روشنی میں خالص جھاڑیاں ہی کام آتی ہیں۔ میرے گھر میں یہ کمال ابّا کا نہیں، ان کے ابّا اور ان کے دادا کا ہے کہ انہوں نے یہ مختصر گھر بنوایا تو انہوں نے بہت آگے دیکھتے ہوئے ہمیں سورج کے ڈوب جانے کے انتظار کی زحمت سے بچا لیا۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ جھنڈ میں شامل عورتیں کیسا محسوس کرتی ہیں اور وہ چیز ان کے اندر کتنی مقدار میں بچ جاتی ہے جسے چھپانے کی خواہش عورتوں میں فطری طور پر ہوتی ہے، ہم انہیں جاتے دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکراتے ہیں اور بس۔ ویسے دن کے اجالے میں کوئی عورت جھاڑیوں کے علاوہ اور کہیں بیٹھی نظر نہیں آتی۔

لیکن مرد......

انہیں شاید رات میں یہ ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ ان کی ضرورت کا دیو ہمیشہ صبح کے اجالے میں منہ اٹھائے نظر آتا ہے۔ وہ بھلے اپنے جانتے، آڑ میں بیٹھیں، دیکھنے والے کہاں تک اپنی نگاہوں کو باندھ سکتے ہیں۔ ہزار عورتوں میں ایک بھی ایسی حالت میں کسی کی نگاہوں میں آ جائے تو وہ ایک لمحہ کے سوویں حصہ میں بھی بیٹھی نظر آ جائے، یہ ممکن ہی نہیں۔ مرد حضرات کو بہت شرم آئے گی تو اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں گے، شتر مرغ کی طرح جو ریت میں اپنا منہ چھپا کر سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو چھپا لیا۔ چھوٹی ضرورت میں تو انہیں آنکھ کی شرم بھی نہیں آتی۔ چلتے چلتے جہاں چاہا، پینٹ کا زپ کھولا اور شروع ہو گئے۔ بس اتنی ہی جگہ کافی ہے ان کے لئے جہاں تک ان کی دھار جا سکے۔ کون آ رہا ہے، کون جا رہا ہے، کس کی نگاہ کہاں پڑ رہی ہے، کون بے موقع آ پھنسا ہے، کون کیا محسوس کر رہا ہے...... انہیں پرواہ نہیں۔

ہماری گلی پر تو ان کی خاص عنایت ہے۔ دونوں طرف نالیاں بہتی ہیں اس لئے ان کے وارے نیارے ہیں، چاہے ادھر کھڑے ہو جاؤ، چاہے ادھر۔ دیواروں پر کھڑکیوں کا ایک جال سا ہے۔ بے شمار روزن جھانک رہے ہیں، لڑکیاں، بچیاں، عورتیں گلی میں آ جا رہی ہیں، انہیں کوئی مطلب نہیں، وہ بڑے اطمینان سے فارغ ہوتے رہیں گے۔

پہلے پہل نگاہ پڑ جاتی تھی تو کتنی گھن آتی تھی جیسے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو۔ احساسِ گناہ

اندر اندر مٹھیوں میں کستا جاتا، اپنے آپ ہی شرمندگی محسوس ہوتی...... غصہ بھی آتا۔ کہیں یہ ان کی احساس برتری تو نہیں......؟

کئی روز تک طبیعت مالش کرتی رہتی، باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا لیکن اماں کے حکم سے نکلنا ہی پڑتا۔ سودا سلف لانے کے علاوہ پانی کا مسئلہ ایسا سنگین ہے کہ ہر حال میں گلی کے نکڑ پر ہی حل ہوتا ہے، ہوش مندی، ہوشیاری سے کام نہ لیا جائے تو اکثر حل ہونے کی بجائے بگڑنے ہی کا ڈر رہتا ہے۔ بھائیوں کو گھر کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کی باہری مصروفیات اس قدر شدید ہیں کہ انہیں گھر کے کاموں کے لئے ٹوکنا بھی گناہ ہے۔ اس قسم کے تمام کام ہم بہنوں ہی کو انجام دینا پڑتا ہے، وہ بھی چھوٹی بہنوں کو...... ظاہر ہے کہ آنکھوں پر پٹی باندھ کے تو نکلا نہیں جا سکتا۔

ہوتے ہوتے یہاں بھی وہی کیفیت......

سرسراہٹ والی......

سارے جسم پر چیونٹیاں سی...... پکڑنے کی کوشش کرو تو ایک چیونٹی بھی ہاتھ نہ آئے۔ بار بار گلی میں جانے کی خواہش سر اٹھاتی رہتی ہے۔ اب اماں کو بھی سودا سلف کی ضرورت کم ہونے لگی ہے، وہ ایک ساتھ ہی سب چیزیں منگوا لیتی ہیں۔ پانی کا خرچہ بھی وہ نہیں رہا جو تھا لیکن جو پانی سر کے اوپر بہتا تھا، وہ اب سر کے نیچے بہنے لگا ہے۔

ویسے ان لوگوں کو لگاتار اس عالم میں دیکھنا ممکن نہیں کیوں کہ اب وہاں پر نگاہوں کی پتنگ مسلسل اڑتی رہتی ہیں، اکثر یہ پتنگ آپس میں ایک دوسرے کو کاٹنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ سب سے کارگر حربہ اچٹتی ہوئی نگاہ ہے کہ سب کچھ دیکھ لیا اور دیکھنے والوں نے سمجھا کہ کچھ نہیں دیکھا، اس کے لئے بڑی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے، ہر کس و ناکس کے بس کی یہ بات نہیں اور نئے لوگوں کے لئے تو بالکل ہی نہیں۔ مجھے بھی نہیں آتی تھی لیکن اب......

پر باجی......

باجی تو ہم کو ایک دم بے وقوف ہی سمجھتی ہیں جب کہ خود ان کی حرکات و سکنات ایسی ہیں کہ......

وہ سارے وہ کام کرتی ہیں جن کے ہم سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ راتوں کو جاگ جاگ کر وہ اماں ابا کا کھیل دیکھتی ہیں۔ بھائیوں کی برہنگی ان کی نگاہوں میں فوراً آجاتی ہے اور کوئی بے چینی

سی انہیں ان پر کپڑے ڈالنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ گلی میں چلتے پھرتے میں نے خود کئی بار ان کی نگاہوں میں وہ چمک دیکھی ہے...... اب یہ اور بات ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ ہوشیار اور تیز ہیں تبھی تو وہ اپنی بظاہر بے معنی اور اچٹتی نگاہوں کو میرے پیچھے سرپٹ دوڑا دیتی ہیں کہ کہیں نگاہوں کے اس کاروبار میں، میں ان کی شریک تو نہیں بن رہی......؟

یہ بات میں پہلے سے جانتی ہوں کہ ان کی دوسری نگاہ مجھ پر اور صرف مجھ پر پڑے گی، اس لئے ان کا تیر ادھر آنے سے پہلے میں اپنا دفاع کر لیتی ہوں۔ انہیں اطمینان ہو جاتا ہے اور وہ......

کبھی کبھی ہماری نگاہیں ٹکراتی بھی ہیں نہ صرف باجی کی نظروں سے بلکہ دوسری بہت سی نظروں سے، پر فکر مجھے صرف باجی ہی کی نگاہوں کی ہے۔ ایسا لگتا ہے باجی نے نگاہوں نگاہوں میں مجھے سرزنش بھی کی ہے...... لیکن یہ خوب رہی کہ وہ دیکھیں تو گناہ نہیں، میں دیکھوں تو بہت بڑا گناہ......

یہی وجہ ہے کہ اب میں بھی بہنوں اور بھائیوں کی ٹوہ میں رہنے لگی ہوں اور ان کی نگاہوں کا تعاقب کرتی رہتی ہوں۔ ان میں سے کوئی ایسا نہیں جو پہلا پتھر مار سکے۔ سب اپنی چور نگاہوں میں گناہ چھپا کر رکھتے ہیں۔

بھیا اور ان کے دوست باہر گلی میں کھڑے ہو کر سرگوشیوں میں جو باتیں کرتے ہیں اور راہ چلتی لڑکیوں کو اشارے کرتے ہیں، وہ مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ بھائی کی غیر موجودگی میں ان کے کچھ دوست تو مجھے بھی اشارے کرنے سے باز نہیں آتے۔ پہلے میں انجان تھی، ان چیزوں کو نہیں سمجھتی تھی، رفتہ رفتہ جان گئی ہوں کہ اشاروں کی الگ ایک زبان ہے جو آتے آتے آتی ہے، ایک دم سے نہیں آ جاتی۔ میں سمجھتی تھی کہ یہ زبان باجی، بھیا وغیرہ کے لئے مخصوص ہے لیکن جب مجھے بھی اس سے واقف کرایا گیا تو میں بھی بڑوں کے زمرے میں آ گئی...... یعنی میں بھی کچھ ہوں۔

مسجد کے مدرسے میں مولوی صاحب سے اردو پڑھنے میں، میں نے کتنی بار مار کھائی ہے، اسے کچھ میں ہی جانتی ہوں، مولوی صاحب ہمیشہ مجھے کوڑھ مغز اور جاہل ہی سمجھتے رہے۔ اس دن چھنو خالہ کے ہاں میلاد شریف میں کسی نے شوشہ چھوڑ دیا کہ میلاد شریف نا کتخدا لڑکی سے پڑھوانا چاہئے۔ اتفاق سے پوری محفل میں نا کتخدا لڑکی صرف میں ہی ٹھہری، پھر میں نے میلاد شریف کی

پہلی کتاب ختم بھی کرلی تھی۔ سب میری جان کو آ گئے اور مجھے لرزتے، کانپتے ہاتھوں سے میلاد اکبر کو کھولنا ہی پڑا۔ اٹک اٹک کر پڑھنے میں مجھے کیا تکلیف ہوئی ہے، وہ تو کہئے کہ پوری محفل ہی ایسے لوگوں کی تھی اس لئے میری جہالت کسی کی گرفت میں نہیں آ سکی اور خدا کا شکر ہے کہ محفل خشوع و خضوع کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔

اس دن سچے دل سے میں نے اعتراف کیا کہ مولوی صاحب جو کچھ کہتے ہیں، غلط نہیں کہتے، پر میں بھی کیا کروں، جتنا دماغ لے کر میں پیدا ہوئی ہوں اور جتنی سمجھ کے ساتھ میں چل رہی ہوں، وہی میری دنیا ہے نا......

کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ اشاروں کی زبان سمجھنے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ اس کے ذریعہ کہی گئی کوئی بات، اس کے ذریعہ دیا گیا کوئی پیغام مجھ تک فوراً پہنچ جاتے ہیں۔ اب یہ ان کا صوابدید ہے کہ وہ میرے چہرے مہرے، جسم کے دوسرے اعضا اور آنکھوں سے کیا پڑھ پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں ان کی زبان میں جواب تو دے نہیں سکتی۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں بنیادی طور پر بس دو ہی زبانیں ہیں، سفید کاغذ پر لکھی جانے والی، رنگین کاغذ پر پڑھی جانے والی...... وہ زبانیں جو آنکھوں سے لکھی جاتی ہیں، جو اشاروں میں بات کرتی ہیں، جو چہرے سے پڑھی جاتی ہیں، جو حرکات وسکنات سے اپنا مفہوم ادا کرتی ہیں...... وہ زبانیں جو جسم ہی سے لکھی اور جسم ہی سے پڑھی جاتی ہیں...... ان زبانوں پر کس ملک اور کس خطے کی مہر لگائی جائے......؟

اماں کہتی ہیں، میں ابھی بچہ ہوں۔

باجی کہتی ہیں، تم ابھی بہت چھوٹی ہو اور بدھو بھی......

سبھی رشتہ دار عورتیں اور دوسری بہنیں مجھے یہ سمجھ کر نظرانداز کرتی ہیں کہ میں تو کچھ جانتی ہی نہیں...... میں ابھی بہت چھوٹی ہوں۔

شاید وہ میرے جسم کو دیکھ کر ایسا سوچتی ہیں، وہ یہ نہیں جانتیں کہ اس جسم کے اندر جو بدن ہے، وہ بچہ نہیں رہا۔ گھر کے لوگ اس بدن کو نہیں پہچانتے لیکن بھیا کے دوست، گلی محلے میں رہنے والے اور راہی مسافر اسے خوب دیکھتے اور پہچانتے ہیں، تبھی تو وہ مجھ سے اس مخصوص زبان میں مخاطب ہوتے ہیں جس سے صرف میں واقف ہوں یا وہ......

جو چیونٹیاں میرے بدن پر سرسراتی تھیں، انہوں نے اب مستقل طور پر میرے اندر

ٹھکانہ بنالیا ہے۔ مجھے ہر دم ایک بے چینی سی محسوس ہونے لگی ہے۔ برتن میں کوئی چیز بہت زیادہ بھر جاتی ہے تو ابلنے لگتی ہے...... میں وہ برتن تو نہیں......؟

میری اس حالت سے سب لوگ بے خبر ہیں یا اپنے اپنے خول میں بند ہیں، جو زمانہ مجھ پر گزر رہا ہے وہ باجی اور دوسری بہنوں پر بھی گزرا ہوگا، پھر انہوں نے کیا کیا......؟

باجی کے پاس وہ جسم بھی ہے جو میرے پاس نہیں اور میرے جسم کے اندر جو بدن ہے، وہ ان کے پاس ضرور ہوگا لیکن باجی سے اس مسئلے پر کچھ کہنا میرے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ جو باجی میری نگاہوں کو ہر دم باندھنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں، وہ میری کیا سنیں گی......؟

میں چاہتی ہوں جو چیز میرے اندر لبالب بھر گئی ہے، اس کا کسی طور اظہار تو ہو، لیکن کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ یہ احساس مجھے ایک عجیب ڈھنگ سے جکڑتا جا رہا ہے۔ پہلے میں اس سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش بھی کرتی تھی، اب اسی میں ایک راحت سی محسوس کرنے لگی ہوں بلکہ کبھی کبھی تو یہ میرے لئے جائے اماں بھی بن جاتی ہے۔ یہ جکڑن مجھے اتنی زور سے بھینچ لے، کس لے کہ میری ہڈیاں بھی چیخ اٹھیں...... میرا حال جو ہو سو ہو، میں اپنے آپ میں کمٹی تو رہوں گی،...... میں بکھرتی جا رہی ہوں، اپنے آپ پر میرا کوئی اختیار باقی نہیں رہا۔ کوئی انجانا ہاتھ بہت بے رحمی سے مجھے دور دور تک بکھیر جاتا ہے اور میں اپنے آپ کو چن کر ایک جگہ جمع بھی نہیں کر سکتی۔ یہ صورت حال میرے لئے خاصی پریشان کن ہے۔

آ کر کوئی مجھے مٹھی بھر کے اٹھالے تو نہ صرف میں خوش خوش اس میں سمٹ جاؤں بلکہ شاید میری الجھن اور تکلیف بھی دور ہو جائے۔ میرے کم سن جسم میں جو جوان بدن بند ہو گیا ہے، اس نے مجھے اندر اندر دو حصّوں میں منقسم کر دیا ہے اور دونوں حصّے الگ الگ سمتوں میں بھاگے جا رہے ہیں، یہ سلسلہ رکنے والا دکھائی نہیں دیتا...... شاید یہ چلتا ہی رہے گا جب تک کہ واقعی کوئی مضبوط مٹھی دونوں حصوں کو ایک ساتھ جکڑ نہیں لیتی۔

اشاروں کی زبان میں مجھے ایک خاص قسم کی مقناطیسی کشش محسوس ہوتی ہے۔ جو کچھ مجھ سے کہا جاتا ہے وہ نہ صرف مجھے اچھا لگتا ہے بلکہ میں اس طرف بے اختیار کھنچتی چلی جاتی ہوں۔ اگر کوئی اپنا ہاتھ بڑھا دے تو میں فوراً اس کو پکڑ لوں۔

اماں کی کڑی نگاہیں......

باجی کی دھیمی مگر تیکھی نصیحتیں......

ابّا کی بے حسی......

وغیرہ وغیرہ...... ان باتوں کو سوچنے کی میرے پاس بالکل فرصت نہیں، چیونٹیوں کی مسلسل سرسراہٹ نے مجھے ایک بالکل الگ ہی شئے میں تبدیل کر دیا ہے اور میں نجات چاہتی ہوں...... صرف نجات......

✠ • ✠ • ✠

آگ کے اندر راکھ

(۱)

خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتی ہوں کہ اب میں وہ نہیں ہوں جو تھی۔

اس سلسلے میں مجھے قسم کھانے کو کہا جائے تو میری پریشانی یہ ہوگی کہ میں کس کی قسم کھاؤں، اپنی یا اس کی جو میری جگہ پر مجھ میں آ گئی ہے اور جسے اپنے آپ میں رہتے ہوئے بھی میں نہیں پہچانتی۔ اس کی قسم تو میں کھا ہی نہیں سکتی جس کی وجہ سے لوگ کہتے ہیں کہ میں ہوں حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ میں وہ ہوں ہی نہیں تو پھر اس کی قسم کیسے کھا سکتی ہوں۔

یا تو قسم کھاؤں ہی نہیں۔

یا پھر جھوٹ بولوں۔

یہ دونوں باتیں بھی صرف میں ہی کر سکتی ہوں، کسی دوسرے کو ان باتوں کی کیا خبر، کوئی دوسرا جان بھی کیسے سکتا ہے، تو پھر میں کیا کروں۔

ان لوگوں کو کیسے سمجھاؤں کہ وہ میرے بارے میں جو کچھ سوچ رہے ہیں نہ سوچیں، ہاتھوں میں مہندی رچانا اور مانگ میں سیندور بھرنا صرف ایک رسم نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے انسانی تاریخ کا سب سے اہم باب پوشیدہ ہے، جس کی ورق گردانی میں نہیں کر سکتی۔ میرے اندر وہ حس باقی ہی نہیں رہی جو اپنی اور دوسرے کی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ میرے اندر، اندر کی گہرائیوں میں وہ تار کہیں بھی موجود نہیں جو دوسرے کا لمس پا کر جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ یہ لوگ جو کچھ سوچ رہے ہیں وہ ظلم ہے...... میرے ساتھ نہیں، اس کے ساتھ جس کا دامن وہ ایک مردہ کے ساتھ باندھنے جا رہے ہیں۔

جس کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی ہی نہ رہی ہو۔

جس کے اندر کے بھی حساس تار بے جان ہو چکے ہوں۔

جو کسی زندہ کو کچھ بھی دینے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔

اسے زندہ کہا جا سکتا ہے کیا......؟

اصل میں وہ ایک چلتے پھرتے گوشت پوست کے ڈھانچے کو زندہ سمجھتے ہیں اور ہزار سمجھانے پر بھی نہیں مانتے جب کہ زندگی کس چیز کو کہتے ہیں، یہ میں ان سے زیادہ جانتی ہوں، اس لئے میں یقین کے ساتھ کہتی ہوں کہ......

(۲)

رات، سیاہ ساڑی باندھ کر سیاہی میں پوری طرح رنگ چکی ہے لیکن میں جس جگہ پر ہوں وہاں اس کے آنچل کی سرسراہٹ بھی سنائی نہیں دیتی۔ کئی بار تو مجھے گمان ہوا کہ رات شاید ابھی آئی ہی نہیں لیکن آنکھوں کی جلن اور دور دور تک سرگوشیاں کرتے ہوئے مہیب سناٹے نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔ میں اس وقت اپنی ڈیوٹی پر ہوں۔ میری ڈیوٹی بہت سخت ہے اور اسے انجام دینا ہرگز آسان نہیں، حالات سازگار ہوتے تو شاید میں اسے قبول بھی نہیں کرتی، میں نے اسے اپنی مرضی سے قبول کیا ہے کیونکہ اس کا معاوضہ مجھے اپنے تصور سے بھی زیادہ مل رہا ہے۔

میرے سامنے آنکھیں موندے، زرد چہرے والا جو آدمی لیٹا ہے وہ نہ صرف جوان ہے بلکہ کافی خوبصورت بھی، بظاہر صحت مند بھی، بہت پیسوں والا ہے، کافی بھرے پرے گھر کا فرد...... کیا نہیں ہے اس کے پاس، جوان بیوی، خوبصورت بچے، خوشحال بھائی بہن، آسودہ حال رشتہ دار، مستعد نوکر چاکر...... اس کی آنکھوں میں جب نور ہوگا اور پیشانی پر چمک، تب وہ یقیناً سب کی آنکھوں کا تارا ہوگا...... سب کی توجہ کا مرکز، اس کے ابرو کے ایک اشارے پر سب دوڑ پڑتے ہوں گے، اس کی ایک چھینک پر سب پریشان ہو جاتے ہونگے، اس کی خوشیاں لوگوں کی خوشیاں ہونگی، اس کا غم دوسروں کا غم، لیکن اب یہ سب شاید تاریخ کے صفحات ہیں جس کے سارے ورق ایک ایک کر کے اس سے الگ ہو چکے ہیں، یہ زندہ تو ہے لیکن مردوں سے بدتر، کسی نے منہ میں نوالا ڈال دیا تو اس کے پیٹ میں چلا گیا، کسی نے دو گھونٹ پانی پلا دیا تو پی لیا، بستر سے اٹھا دیا تو اٹھ گیا، لٹا دیا تو لیٹ گیا، ہنستا ہے نہ روتا ہے، بے حس و حرکت پڑا سب کو تکتا رہتا

ہے۔اس کی زندگی اس کے ہاتھوں سے چھین کر دوسروں کے حوالے کردی گئی ہے۔ بول براز تک پراس کا قابو نہیں، اس کے سارے کاموں کے لئے خدمت گار موجود ہیں، پہلے نگرانی گھر والوں کی تھی، یہ نگرانی بھی بوجھ بن گئی تو ایک ایسی کٹھ پتلی کی تلاش شروع ہوئی جو ہو تو گوشت پوست کا بنا ہوا لیکن اس کے سارے اعضا مشین کے پرزے ہوں، جو اپنی حس ختم کر کے اس کی حس اپنے اندر بھر لے، نہ اس کی اپنی کوئی خوشی، نہ اس کا اپنا کوئی غم، جو کچھ بھی ہو بس اس کا ہو...... ایک ایسا وجود جو اسے پوری طرح اپنے اندر حلول کر لے، ایک ایسی مخلوق جو اپنی روح تک میں اس کو اتار لے...... ظاہر ہے کہ ایسی کوئی شئے بہت قیمتی ہی ہو سکتی ہے۔

میرے پاس جوانی تھی، ذہانت، دنیا کو زیر کر دینے کی ہمت، خطرات میں کود پڑنے کا حوصلہ...... بس ایک کمی رہ گئی تھی جس کے سبب میں کبھی ایک نگاہ غلط انداز کی سائل نہ بن سکی، چنانچہ میں نے منہ مانگی قیمت پر اپنی شخصیت کو اس میں مدغم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

(۳)

سامنے لیٹا ہوا یہ خوبرو مرد، مردہ بدست زندہ کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے...... سانس لیتا ہوا ایک ممی...... اس کی آنکھیں کھول دی جاتی ہیں تو یہ جاگ اٹھتا ہے، بند کر دی جائیں تو سو رہتا ہے، یہ بول نہیں سکتا، کوئی اشارہ نہیں کر سکتا، یہ کسی کی سنتا بھی ہے یہ کہنا مشکل ہے، اس کے سننے نہ سننے کا کوئی ثبوت کسی کے پاس نہیں ہے۔

اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے ہیں، میں دیر تک جاگنے کی کبھی عادی نہیں رہی لیکن جب میں نے یہ ذمہ داری قبول کی تھی، اس وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اب مجھے وہ نہیں رہنا چاہئے جو میں ہوں، میں نے اپنے عادات واطوار، جذبات وخیالات، افکار واوقات کا سودا کر لیا ہے تو پھر مجھے اسی انداز میں رہنا چاہئے، میں نے اسے وقت پر کھانا کھلا دیا ہے، دوائیں دے دی ہیں، اس کے پپوٹے بند کر کے سلا دیا ہے۔اس کی بیوی مجھ سے کہہ گئی ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو اسے فوراً آواز دے دوں، وہ بغل کے کمرے سے میری مدد کو آپہنچے گی۔ مریض سو گیا ہے تو مجھے بھی سو رہنا چاہئے۔ کمرے کے ایک گوشے میں میرا بستر لگا ہے، اس کمرے میں آج صرف دو افراد سوئیں گے، ایک نوجوان کنواری لڑکی، اور ایک خوبرو جوان......

رات کی خاموش تاریکی......

ماحول کی تنہائی......

ایک لمحے کے سوویں حصے میں کوئی خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندتا ہے، پھر فوراً ہی راکھ بن کر اڑ جاتا ہے۔ مجھے کچھ سوچنے کا بھی حق نہیں۔ یہ صورت حال میں نے اپنی مرضی اور منہ مانگی قیمت پر قبول کی ہے...... یہ جوان صرف ایک مریض ہے، جس کی تیمارداری کرنا میرا فرض۔

اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس پر کوئی غیر معمولی واقعہ گزر رہا ہے، حالانکہ اس کے کسی عمل سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہوا، یہ تو بے حس و حرکت ہے۔ شاید...... شاید اس کے کپڑے گیلے ہو گئے ہیں، انہیں تبدیل کرنا بہت ضروری ہے، ڈاکٹروں نے تاکید کی ہے کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو فوراً انفکشن ہو جانے کا خطرہ ہے۔ میں غیر ارادی طور پر اٹھتی ہوں، پھر فوراً ہی رک جاتی ہوں، یہ سوچ کر مجھے جھرجھری سی آجاتی ہے کہ مجھے اس کے کپڑے تبدیل کرنے ہوں گے......؟ اگرچہ یہ شخص بے حس و حرکت ہے، پھر بھی اس کے پاس ایک مردانہ جسم تو ہے...... میں نے اپنے جذبات و خیالات پر پیسوں کا تالا لگاتے ہوئے یہ بات تو سوچی ہی نہیں تھی، لیکن میں نے اس کی مکمل خدمت کا ذمہ لیا ہے تو پھر اس کام میں مجھے عار ہونا چاہئے کیا......؟

میرے قدم کئی بار اٹھے، کئی بار رکے، اس قسم کے اتار چڑھاؤ کا بالکل موقع نہیں ہے، دیر ہو رہی ہے مریض کو انفکشن لگنے کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے، میں بار بار مصمم ارادہ کرتی ہوں لیکن میرے اندر کوئی چیز ہے جو روکنے کی کوشش کر رہی ہے، ایسا ہرگز ہونا نہیں چاہئے، کسی نرس کو جذبات سے کیا لینا دینا، میں بھی تو ایک نرس ہی ہوں، جو بھی خدمت یہاں انجام دے رہی ہوں، اس کی پوری پوری قیمت مجھے ملے گی، اس لئے ہر چیز بھول کر مجھے صرف وہ کرنا چاہئے جو ضروری ہے اور جس سے مریض کی جان بچ سکتی ہے۔

کسی مرد کے ستر کو کھولنا، اسے صاف کرنا، اسے دوسرے کپڑے پہنانا...... سوچنے اور کرنے میں کیا فرق ہے، یہ صرف میں ہی محسوس کر سکتی ہوں، یہ فرض دراصل اس کی بیوی کا ہے، ان لوگوں نے میری اس خدمت کا کوئی دوسرا معنی نکال لیا تب......؟

فوری طور پر میرے ذہن میں جو بات آتی ہے وہ یہ کہ میں دوڑ کر اس کی بیوی کو بلا لاؤں، سو میں یہی کرتی ہوں۔

اس کا کمرہ اندر سے بند ہے۔ دیر تک گھنٹی بجانے اور لگاتار دستک دینے کے بعد دروازہ کھلتا ہے۔ نیند میں مدھ ماتی آنکھوں سے اس کی بیوی مجھے گھورتی ہے۔

''میڈم...... شاید صاحب کو کپڑے بدلنے کی ضرورت ہے......''

میں اپنی ہکلاہٹ اور بے چینی پر قابو پا کے جواب دیتی ہوں۔

''تو......؟''

اس کا انداز خاصا تیکھا ہے، میں بوکھلا جاتی ہوں، لیکن اپنے آپ پر قابو رکھتی ہوں۔

''ان کی باڈی کو صاف کر کے کپڑے تبدیل کرنا ہوگا......؟''

''پھر تمہیں کس بات کے لئے رکھا گیا ہے......؟ اتنی مہنگی نرس ہو تم......''

وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، بیشک میں بہت پیسے پر رکھی گئی ہوں لیکن کیا مجھے وہ سب کام بھی انجام دینے ہوں گے جو صرف ایک بیوی ہی کو کرنا چاہئے، ایک جوان غیر مرد کا میرے سامنے برہنہ ہونا...... کیا اس عورت کو نہیں معلوم کہ میں ایک کنواری لڑکی ہوں اور یہ معاملہ اس کے شوہر کا ہے، جو ابھی زندہ ہے اور اس کے صحت یاب ہو جانے کی امید ابھی ختم نہیں ہوئی۔

''دیکھو مجھے نیند آرہی ہے، پلیز اس کام کو تم ہی کر دو، اور پیسے چاہئیں تو کہنا......'' اس کی بیوی سوچ کے سارے دروازے کو یکلخت بند کرتے ہوئے اپنا دروازہ بند کر لیتی ہے۔ میرے پاس بھی سوچنے سمجھنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ مریض کو گندی حالت میں رہتے ہوئے یوں بھی کافی دیر ہو چکی ہے، اسے یا تو انفکشن لگ چکا ہوگا، یا بس اب لگنے ہی والا ہوگا۔

میں اپنے فرض کو محسوس کرتے ہوئے صفائی کی مہم میں فوراً جٹ جاتی ہوں، پہلے ایک ایک کر کے اس کے کپڑے اتارتی ہوں، پاجامے کا ازار بند کھولتے ہوئے میرے ہاتھ بار بار کانپ جاتے ہیں۔ بچپن میں شاید اپنے چھوٹے بھائیوں کے پاجامے بھی میں نے نہیں اتارے، یوں بھی اس سے پہلے مرد کے مفہوم کو میں نہیں جانتی تھی، جانتی بھی ہوتی تو ایک غیر جوان مرد کے برہنہ جسم کا تصور میرے ذہن میں کہاں سے آتا...... میری آنکھوں کے سامنے چاروں طرف دھواں دھواں سا کچھ پھیل جاتا ہے، اسی وقت اس کے جسم سے خارج ہوتا ہوا بدبو کا بھبکا میری مدد کو آجاتا ہے، میں

اپنی ناک پر مضبوطی سے کپڑے کی ایک پٹی باندھ لیتی ہوں اور اپنے ذہن کو یک طرفہ راستے کی طرف دوڑانے کی کوشش کرتی ہوں کہ اس وقت میرا کیا فرض ہے اور مجھے کیا کرنا چاہئے۔

میں سب کچھ بھول کر نہایت یکسوئی کے ساتھ اس کے بدن کے ایک ایک حصے کو خوب اچھی طرح صاف کرتی ہوں، بھیگے کپڑے پر صابن لگا کر اس کے جسم کو رگڑتی ہوں، پانی کی پھواریں ڈالتی ہوں، پھر تولئے سے جذب کرتی ہوں، جسم کو خشک کرنے کے بعد پاؤڈر لگاتی ہوں، پھر صاف ستھرے کپڑے پہناتی ہوں، اس کے بعد سر میں تیل ڈال کر دیر تک مالش کرتی ہوں، ان سارے عمل میں بس وہ مجھے ٹکر ٹکر دیکھتا رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں متحرک رہتی ہیں، یہ آنکھیں ہی ہیں جو اس کی زندگی کا اعلان نامہ ہیں۔۔ بہت دیر تک مجھے مغالطہ رہتا ہے کہ وہ مجھے ہی دیکھ رہا ہے۔ میرے اندر ایک عجیب سنسنی سی پیدا ہو جاتی ہے، آخر کو وہ ایک جوان مرد ہے، ایک شاندار جسم کا مالک، صحت یاب ہو جائے گا تو اس کی ایک ایک نگاہ کی کتنی قیمت بڑھ جائے گی۔ وہ خود بھی اپنی ان نگاہوں کی کتنی حفاظت کرے گا۔ آج کسی نامعلوم بیماری کے سبب اس کا جسم معطل ہو گیا ہے تو اس کی نگاہوں نے اپنا وقار کھو دیا ہے، میں دائیں طرف سے بائیں کو ہو جاتی ہوں، اس کی پتلیاں دائیں محور پر ہی گھومتی رہیں......

میرے اندر ایک بدلی ہوئی شخصیت اچانک اٹھ کھڑی ہوتی ہے جو ایک نوجوان کنواری لڑکی سے بالکل مختلف ہے، اس کو جذبات سے دور دور کا کوئی واسطہ نہیں۔ بے حس و حرکت لیٹا ہوا یہ مرد جسے ابھی ابھی میں نے گندگی سے نکال کر صاف ستھری دنیا میں لایا ہے، کتنا مجبور و بے بس ہے، اپنی مرضی سے ہنس نہیں سکتا، اپنی خواہش سے رو نہیں سکتا، اسے پتہ تک نہیں کہ اس کے جسم سے بول براز کب خارج ہوتے ہیں، اس مرد اور ایک نوزائیدہ بچے میں کیا فرق ہے۔ حالانکہ میں ایسے کسی بچے کو بھی نہیں جانتی لیکن پھر بھی میں ایک عورت تو ہوں، اس لئے ان باتوں کو محسوس تو کر ہی سکتی ہوں۔ اس کھلونے کو ابھی ابھی میں نے ہی سجایا اور سنوارا ہے، میرے اندر ایک نامعلوم قسم کی ممتا امڈ پڑتی ہے اور میں ہولے ہولے اس کی پیشانی پر اپنا ہاتھ پھیرنے لگتی ہوں۔

(۵)

صبح اس کی بیوی ممنون نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہے، میں انجان بننے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ کہتی ہے۔

”رات تم نے ہم پر بڑا احسان کیا، ایک بہت بڑا بوجھ ہمارے سر سے اُتار دیا......“

"میں نے تو بس اپنا فرض ادا کیا، احسان کی کیا بات ہے......"

میں آہستہ سے جواب دیتی ہوں۔

"بالکل احسان کی بات ہے۔ پیسے تو بہتوں نے لئے ایسا کام کسی نے نہیں کیا......"

میرے پاس اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں، میں خاموش رہتی ہوں، وہ رازدارانہ انداز میں کہتی ہے۔

"رات جان بوجھ کر میں نے تمہاری مدد نہیں کی، میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اپنے طور پر تم کیا کچھ کر سکتی ہو، سو تم اس امتحان میں پوری اتریں، اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرا مریض بہت ہی محفوظ ہاتھوں میں ہے......"

میں کوئی جواب نہیں دیتی، صرف اسے دیکھتی رہتی ہوں، پتہ نہیں اس نے اس کا کیا مطلب نکالا، وہ بڑے اعتماد بھرے لہجے میں کہتی ہے۔

"پیسوں کی کوئی بات نہیں، تم زیادہ پیسے بھی مانگو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں، مجھے یقین ہے کہ اس مریض کو تم بہت خوش اسلوبی سے سنبھال سکو گی......"

اس کی بیوی کچھ زیادہ ہی اخلاق سے پیش آرہی ہے۔ میں خوب سمجھتی ہوں کہ اس کے کہنے کا کیا مطلب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب مجھے اس کی خدمت پر سوفی صد جٹ جانا ہوگا، اب کوئی میری مدد نہیں کرے گا، ابھی تک میں اس کی بیوی اور دوسرے لوگوں کی مددگار کی حیثیت رکھتی تھی، اب یوں ہے کہ وہ لوگ میرے مددگار ہوں گے، وہ بھی میری نہیں، ان کی اپنی مرضی کے مطابق۔ وہ میری مدد نہ کریں تو میں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی جب کہ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں اپنی خدمات بیچ چکی ہوں نا......

(۶)

نہلانا، دھلانا، کھلانا، پلانا، گندگی صاف کرنا، کپڑے تبدیل کرنا...... میں ایک بچے کی طرح اس کی دیکھ بھال کر رہی ہوں۔ میں یہ کہوں کہ یہ میرے ہاتھوں کا کھلونا ہے تو یہ بھی سچ نہیں کہ کھلونے بول براز نہیں کرتے، اسے مردہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ حس کے علاوہ اس میں ساری علامتیں زندہ کی ہیں۔

کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس میں حس ہوتی تو میں اتنی آسانی سے اس کی انگلی

کے کسی پور کو بھی چھو سکتی تھی کیا......؟ اس مرد کے اندر وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک جوان عورت کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ میرے سامنے...... میرے سامنے تو اس کے جسم کے سارے اعضا بلا جھجک کھل جاتے ہیں۔ اس وقت میری کیا کیفیت ہوتی ہے اور میں کس طرح اپنے آپ پر قابو رکھنے کی کوشش کرتی ہوں، یہ صرف میں ہی جانتی ہوں، یہ میری زندگی کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ میں نے آج تک کسی مرد کے جوان جسم کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا، میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میری خدمت کا جذبات سے دور دور کا کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن میں اپنے اندر کے انسان کی کیسے ان دیکھی کر سکتی ہوں۔ اس انسان کے اندر ایک دھڑکتا ہوا دل بھی ہے جو کسی انجانے لمس سے تیز تیز دھڑکنے لگتا ہے، کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ جب یہ مرد اچھا ہو جائے گا اور اس کی گمشدہ حس اسے واپس مل جائے گی تو کیا اس کا لمس پھر مجھے نصیب ہو سکے گا......؟

سچی بات یہ ہے کہ میں اس مرد سے انجانی انسیت سی محسوس کرنے لگی ہوں۔ اس کا جسم میرے سامنے کھل جاتا ہے تو اپنے آپ کو بہت سمجھانے، بجھانے پر بھی میری نگاہیں اس پر سے ہٹنے کا نام نہیں لیتیں۔ میرے پورے بدن میں ایک سنسنی سی پھیلتی رہتی ہے۔ میں اپنے ہونٹوں کے اوپری حصے پر آئے پسینے کی ننھی ننھی بوندوں کو بار بار صاف کرتی ہوں۔ میرے امتحان کا یہ ایک کٹھن مرحلہ ہوتا ہے، میں پوری کوشش کرتی ہوں کہ اس امتحان میں کامیاب رہوں۔ میں اپنے اندر کی ایک جوان، کمزور، جذباتی لڑکی سے لڑنے لگتی ہوں، بہر حال میں ایک ذمہ دار، مضبوط اور فرض شناس لڑکی ہوں، جسے اپنی کمزوریوں پر قابو پانا بھی جاننا چاہئے۔ اس کوشش اور کشمکش میں بار بار ہارتے ہوئے جذباتی، کمزور لڑکی کی رہی سہی طاقت ختم ہوتی جاتی ہے۔

(۷)

ان لوگوں نے اب ادھر آنا تقریباً بند کر دیا ہے۔ کبھی کبھار جھانک کر صرف خیریت پوچھ لیتے ہیں۔ ویسے میں اپنے طور پر اس کی بیوی کو روزانہ رپورٹ کر دیتی ہوں۔ ایسا کرنے کو کسی نے مجھ سے کہا نہیں لیکن ظاہر ہے اس کام کے میں پیسے لیتی ہوں تو مجھے جواب دہ بھی ہونا چاہئے۔ اس سے مجھے بھی تشفی رہتی ہے۔ مجھے لاشعوری طور پر محسوس ہوتا ہے کہ میں اس قدر قربانی دے کر، نہایت جانفشانی سے اپنا فرض انجام دے رہی ہوں تو یہ چیز ضائع نہیں ہو رہی ہے، کسی نہ کسی سطح پر اسے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس احساس کے لطف سے میرے اندر ایک نئی زندگی، ایک نئی امنگ پیدا

ہو جاتی ہے اور میں پہلے سے بھی زیادہ تندہی کے ساتھ ایک کمزور جذباتی لڑکی کو شکست دینے کی مہم میں جٹ جاتی ہوں۔

لیکن میں اتنی کوششوں کے باوجود اس اڑتے ہوئے خیال کے پنکھ کاٹنے میں ناکام ہو جاتی ہوں جو بار بار میرے ذہن و جذبات کے خرمن پر آکر بیٹھ جاتا ہے اور ہر بار ایک نئی اور پراسرار لذت چھوڑ جاتا ہے۔ میں بار بار اس کو بھگاتی ہوں، وہ بھاگ بھی جاتا ہے مگر صرف وقتی طور پر، اور بھاگنے سے پہلے میرے اندر ایک جھرجھری بھی چھوڑ جاتا ہے، میرا بدن پسینے کی ننھی ننھی بوندوں سے نہا جاتا ہے، وقتی طور پر میں آگے کچھ سوچ نہیں پاتی، میری آنکھوں کے سامنے جو ایک اندھی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے اس کے آگے میں کچھ دیکھ نہیں پاتی۔

اس عالم میں کہ یہ شخص میرے سامنے یوں ہوتا ہے کہ اس وقت کوئی ہلکی سی ململ کی دیوار بھی ہمارے درمیان حائل نہیں ہوتی، اس وقت اس کی حس ایک لمحہ کے لئے واپس آجائے۔

صرف ایک لمحہ کے لئے......

بس ایک لمحہ......

(۸)

میں ہر لمحہ کڑے امتحان سے گزرتی ہوں، اب تک میرے قدم ثابت رہے ہیں، آگے نہیں کہہ سکتی۔ میرا خیال تھا کہ امتحان کے جس چکر میں گرفتار ہوگئی ہوں، اسی کے چکر کاٹتی رہوں گی اور ہر چکر میں کامیاب ہونے کی کوشش کرتی رہوں گی، یہ تو مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ ابھی اور کڑے امتحانات میرے منتظر ہیں۔

میرے ہاتھوں کا کھلونا ایک روز سوتے ہی بستر سے نیچے گر گیا، اس کے منہ سے آواز تک نہ نکلی، کمرے میں میں بھی سوئی ہوئی تھی، کام کی تھکن اور لگاتار ذہنی الجھنوں کے سبب میں اس قدر مدہوش تھی کہ مجھے خبر بھی نہ ہوئی، صبح نیند ٹوٹی تو میں نے اسے زمین پر پڑا دیکھا، جیسے کوئی مردہ...... میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا، میں نے جلدی سے اس کی نبض ٹٹولی، شکر ہے کہ نبض چل رہی تھی، اسے اٹھا کر بستر پر لٹانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں دوڑ کر اس کی بیوی اور دوسرے رشتہ داروں کو بلا لائی، اسے یوں زمین پر بے حس و حرکت پڑا دیکھ کر ان کا ردعمل بڑا عجیب تھا، انہوں نے مجھے یوں گھورا جیسے اس حادثے کی میں ہی ذمہ دار ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کی ان نگاہوں کا

میں کیا جواب دوں۔ میرا قصور اگر تھا تو بس اتنا کہ اس کے گرنے کی مجھے فوراً خبر نہ ہوئی۔ چوبیس گھنٹوں کی لگا تار تھکن سے اگر میں چور چور نہ ہوتی تو یوں بدحواسی کی نیند کبھی نہ سوتی۔ بہر حال، ان لوگوں کی مدد سے اسے بستر پر لٹا کر اس کی بیوی سے میں نے درخواست کی کہ وہ بھی اسی کمرے میں سونے کا انتظام کرے تاکہ آئندہ یہ حادثہ نہ ہو۔

''اس کام کے ہم تمہیں بہت پیسے دیتے ہیں۔ پھر یہ کیا ہے بھئی کہ یہ نیچے گر گئے اور تمہیں پتہ بھی نہیں چلا......؟''

اس کی بیوی میرے مشورے کو نظر انداز کر کے بہت تیکھے لہجے میں پوچھتی ہے۔ میں اس کا کیا جواب دے سکتی ہوں۔ لیکن ایک لمحے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ چپ نہیں رہنا چاہئے، میں دھیرے سے کہتی ہوں۔

''میں تو ہر دم لگی ہی رہتی ہوں میڈم...... میں جاگتی ہوتی تو ایسا کبھی نہیں ہوتا......''

وہ تڑسے جواب دیتی ہے۔

تو پھر نیند میں خیال کون رکھے گا......؟''

میں بھی سوال کرنے میں دیر نہیں کرتی۔

''وہ کس طرح میڈم......؟''

''وہ اس طرح کہ تم بھی اسی بستر پر سوؤ۔ دیوار کی طرف یہ رہیں گے تو پھر گرنے کا خطرہ باقی ہی نہیں رہے گا......''

شاید وہ یہ بات پہلے سے سوچ کر آئی ہے۔ میں بھونچکی ہو کر اس کی شکل دیکھتی رہ جاتی ہوں۔

''کیا کہہ رہی ہے یہ عورت......؟ دوسری عورت کو اپنے مرد کے ساتھ سونے کے لئے کہہ رہی ہے......؟ ٹھیک ہے ابھی وہ بے حس ہے لیکن اس کے پاس ایک جوان جسم بھی تو ہے جس پر سو فی صد صرف اسی کا حق ہے۔ پھر دوسری عورت تو بے حس نہیں...... یعنی میں...... یہ عورت کچھ سمجھ بھی رہی ہے کہ وہ کتنا خطرناک کھیل کھیلنے جا رہی ہے......؟

یوں میں نے اس کی غلامی اختیار نہیں کی ہے۔ چاہوں تو ابھی انکار کر دوں، چاہوں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ابھی نکل جاؤں۔ میں نے اپنی خدمات بیچی ہیں۔ اپنے آپ کو نہیں بیچا۔

لیکن میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اگر میں واقعی چھوڑ کر چلی گئی تو وہ سب مل کر اسے مار ہی ڈالیں گے۔ یوں بھی وہ بہت بے صبری سے اس کے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس سے جو کچھ انہیں لینا تھا لے چکے، اس کی زندگی اب ان کے کسی کام کی نہیں۔ لیکن ایک رسم دنیا ہے، جسے وہ بیچارے نبھائے جا رہے ہیں۔ ہے تو یہ کچھ چھوٹا منہ بڑی بات والا معاملہ لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ اگر میں بروقت یہاں نہ آجاتی تو اب تک یہ لوگ اسے مار چکے ہوتے۔ میں نے جس طرح جی جان سے اس کی خدمت کی ہے، اس سے وہ میرے لئے صرف ایک مریض نہیں رہا، میں نے اسے ایک نئی زندگی دینے کی کوشش کی ہے، اور جب تک وہ سانس کی ڈور سے بندھا ہوا ہے، تب تک اس کے اچھا ہو جانے کی امید تو باقی ہی رہے گی۔ اسے چھوڑ کر جانا میرے بس کی بات نہیں رہی ہے۔

(۹)

میرے حامی بھرنے پر وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور بہت خوش خوش بستر کو یوں ایڈجسٹ کرتے ہیں کہ دیوار کے رخ پر وہ سوئے گا، دوسری طرف میں...... انہوں نے بہت ہی سرسری انداز میں مکمل طور پر اسے میرے حوالے کر دیا ہے، یہ سوچ کر کہ انہوں نے ایک مشین خرید لی ہے جو بٹن دبانے پر سارے کاموں کو انجام دے دیتی ہے۔ میں نے بھی خاموش زبان سے انہیں اپنے آپ کو مشین ہی بتایا ہے۔ یہ میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا کہ میرے اندر ایک دھڑکتا ہوا دل بھی ہے، سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے والا ایک دماغ بھی، ایک بے حد حساس اور کنوارا جسم بھی۔

پہلی رات مجھ پر کیسی گزری......؟

لیکن یہ کون سی رات تھی......؟

کنواری لڑکیوں کی زندگی میں ایک رات...... پہلی رات ایسی ہوتی ہے جس کے خواب وہ اس وقت سے دیکھنا شروع کر دیتی ہیں جب ان کی پلکوں پر قوس قزح سجنے لگتے ہیں۔ میری پلکوں پر بھی یہ رنگ ضرور آئے ہوں گے لیکن ان کی تعبیر یہ ہوگی، یہ تو میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

واقعتاً وہ ایک مناسب اور پرکشش اعضا کا مالک ہے۔ اس کے جسم میں وہ مقناطیسیت ہے جو دوسرے جسم میں فوراً کرنٹ دوڑا سکتی ہے۔ میں حتی الامکان تمام باتیں ذہن سے نکال کر رات کی ساری ضروریات پوری کرتی ہوں۔ اس کے بعد کمرہ بند کرنا ہے، لائٹ آف کرنا اور بس سو جانا...... لیکن پتہ نہیں کون سی چیز مجھے یہ سب کرنے سے روک رہی ہے۔ میں دیر تک کرسی پر

بیٹھی ایک کتاب کے اوراق پلٹتی رہتی ہوں، حالانکہ اس کے کسی سطر پر میری نگاہ ٹھہر نہیں رہی ہے، مجھے الفاظ سجھائی نہیں دے رہے۔ یہ احساس میرے سارے احساسات پر حاوی ہے کہ آج مجھے ایک غیر مرد کے ساتھ اس کے بستر پر سونا ہے، وہ ضرور بے حس ہے لیکن میں تو ہرگز نہیں۔ مجھے ایسا کرنے پر مجبور کرنے والوں نے صرف اس کے بارے میں سوچا، میرے بارے میں بالکل نہیں سوچا، ٹھیک ہے میرے جذبات کو پیسے کے بھاری پتھر نے دبا رکھا ہے لیکن کبھی تیز و تند آندھی نے پتھر کو اپنی جگہ سے کھسکا دیا تب......؟

کسی کو میرے بارے میں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں، میں یہ بھی اچھی طرح جانتی ہوں کہ خود بھی سوچ سوچ کر کیا کرلوں گی۔ جو صورت حال میرے سامنے ہے، وہ میں نے خود قبول کی ہے، انکار کر دیتی تو کوئی پھانسی پر نہیں چڑھا دیتا، اس لئے بہتری اسی میں ہے کہ مقصد کو سامنے رکھا جائے، میں خود سامنے نہ رہوں۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ نیند میری آنکھوں میں جلن پیدا کر رہی ہے لیکن میری پلکیں بغاوت پر آمادہ ہیں۔ کمرے میں ہلکے سبز رنگ کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ وہ بے سدھ پڑا ہے، نائٹ بلب میں بھی، میں اچھی طرح اس کی شکل دیکھ سکتی ہوں...... اس کے پورے جسم کو بھی، بے شک اس کی شخصیت ایسی ہے کہ اسے بار بار دیکھا جائے، اگر وہ اپنی کسی نامعلوم بیماری کے سبب بے حس نہ ہوتا تو کیا اس پر پڑنے والی نگاہیں اتنی بے وقعت ہوتیں......؟

میری پوری کوشش ہے کہ ایک بستر پر سوتے ہوئے بھی اس سے ایک باوقار فاصلہ قائم رہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ میں جاگ رہی ہوں اس لئے محتاط رہ سکتی ہوں، وہ سو رہا ہے، اس کے حواس بے شک منجمد ہیں، وہ کس طرح محتاط رہ سکتا ہے......؟

نیند کی حالت میں اس کے ہاتھ پیر بار بار میرے جسم سے مس ہو جاتے ہیں، میرے پورے جسم میں سنسنی پھیل جاتی ہے، میرے دل کے پتہ نہیں کون سے گمنام گوشے میں عجیب خواہش سر اٹھاتی ہے کہ اگر اس کے اعضا میرے جسم سے مس ہوتے ہیں تو ہونے دوں......

تھوڑی ہی دیر کے لئے سہی......

لیکن میرا فرض فوراً مجھ پر غالب آجاتا ہے اور میں اس کے اعضا کو بہت احتیاط سے الگ کر دیتی ہوں، پتہ نہیں کیوں مجھے اس وقت اچانک، شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں بالکل

تنہا ہوں۔ میرا کوئی نہیں، میں ڈال سے گرا ہوا وہ پھول ہوں جس کا مقدر روندا جانا ہے۔

(۱۰)

اس رات میں سو تو گئی لیکن نہیں سونے کے برابر...... بلکہ جاگنے کے برابر، ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہا کہ کہیں وہ میرے اتنے قریب نہ آ جائے کہ......

میں اس کے اتنے قریب نہ ہو جاؤں کہ......

سوتے جاگتے کی اس کیفیت میں، جب ہوش و حواس کا ایک وقفہ آتا ہے تو اپنا تجزیہ کرنے کے بعد یہ راز مجھ پر کھلتا ہے کہ میرے دل کو کوئی دھڑکا نہیں لگا، میں تو اس انتظار میں تھی کہ......

لیکن یہ داستان پہلی رات کی ہے...... داستان کے پہلے باب کی، مجھے تو ہر روز اس کے ساتھ سونا ہے اور ہر روز اسی کیفیت سے گزرنا ہے۔

صبح اٹھ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بالکل غیر ارادی طور پر میں مسکرا دیتی ہوں، ایک مبہم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بھی آ جاتی ہے جو قطعاً میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میری مسکراہٹ کے پیچھے جو مفہوم ہو سکتا ہے، اس کے تو کچھ معنی نکالے جا سکتے ہیں، میں نے اس کے پیچھے بہت سی چیزوں کو چھپانے کی کوشش کی ہے، اس کے ذریعہ میں نے اپنے چہرے کو اس لائق بنایا ہے کہ وہ ایک مطمئن شکل نظر آ سکے، جس سے آنے والے کٹھن دنوں کا آسانی سے مقابلہ کیا جا سکے۔ میں نے اپنی مسکراہٹ کے ذریعہ اپنے طور پر ایک مورچہ بنا لیا ہے۔

میری سوتی جاگتی راتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، کبھی سوتی ہوں، کبھی جاگتی ہوں، دونوں حالت میں، میری آنکھوں میں انتظار کی ایک نامعلوم جوت سی جلتی رہتی ہے۔ وہ بے سدھ ہو کے سویا رہتا ہے۔ میں لیٹی لیٹی انتظار کرتی رہتی ہوں کہ کب وہ اپنے ہاتھ پاؤں مارے اور کب وہ میرے جسم سے مس کر جائیں۔ کبھی ایسا ہو بھی جاتا ہے، تب میرے اندر سرشاری اور فرض میں فوراً جنگ شروع ہو جاتی ہے اور آخر میں جیت فرض کی ہوتی ہے۔

کبھی کبھی انتظار کے لمحات طویل بھی ہو جاتے ہیں......

طویل ہوتے جاتے ہیں...... ان کا کہیں خاتمہ دکھائی نہیں دیتا۔

جب سرشاری غالب ہونے لگتی ہے اور میں خاموش رہتی ہوں تو یہ کیفیت اس وقت تک اسی طرح قائم رہتی ہے جب تک مجھے یہ احساس نہیں ہوتا کہ میری یہ خاموشی مجرمانہ ہے......

کبھی کبھی یہ سوچتی ہوں کہ یہ شخص صحت یاب ہوگیا، اس کی حس واپس آگئی تو میرا کیا ہوگا......؟

میری زندگی میں وہ پہلا مرد ہے جس کے ساتھ میں اتنے دن رہی ہوں۔ اس بیچ اس کے اور میرے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں رہا۔ اس کے جسم کا ہر گوشہ میری نگاہوں سے گزرا ہے۔ میں نے اس کے جسم کی آبیاری کی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ بہت پیسے خرچ کرنے کے بعد بھی میری جگہ کوئی دوسرا اس کی یوں خدمت کر سکتا تھا۔

بے معنی تعلق کس طرح چپکے چپکے اپنی جگہ بنالیتا ہے اور دھیرے دھیرے اپنی بنیادیں مضبوط کرتا جاتا ہے۔

میں یہ بھی نہیں جانتی کہ جب یہ چیز ختم ہوگی تو اس سے پیدا شدہ خلا مجھے اپنی کون سی شکل دکھائے گا۔

کیا میں اس چیز کو اپنے اندر سے کھرچ کر ختم کر سکوں گی۔

(۱۱)

اس دن صفائی اور دوسری مصروفیات میں، میں بالکل تھک گئی اور بے سدھ ہو کر بستر پر گر گئی۔ پتہ نہیں رات کا وہ کون سا پہر تھا۔ عالم خواب میں مجھے ایک بے پناہ انجانی لذت کا احساس ہوا۔ عالم بیداری میں بھی کہ وہ عالم خواب سے بھی بہت آگے کی چیز تھی، میں بہت دیر تک اس لذت میں ڈوبی رہی، بہت دیر تک تو میں سمجھ ہی نہیں سکی کہ لذت کی یہ دھیمی دھیمی پھواریں کدھر سے آرہی ہیں...... آخر عالم بیداری نے عالم خواب پر کسی طرح فتح پائی اور میں نے اپنے ہوش وحواس میں یہ محسوس کیا کہ اس کا بھاری مردانہ ہاتھ میرے سینے پر دھرا ہے۔

ایسا لگا جیسے مجھے تیز کرنٹ لگ گیا ہو۔

اس وقت فوراً یہ ہونا چاہئے تھا کہ میں اس کے ہاتھ کو جھٹک دیتی اور کچھ دیر کے لئے ہی سہی، اپنے آپ کو سنبھال کر اٹھ بیٹھتی، لیکن میں نے یہ سب کچھ نہیں کیا اور اتنا تیز کرنٹ لگنے کے باوجود ایک عجیب، نامعلوم خود سپردگی کے عالم میں اسی طرح پڑی رہی۔ پھر میرے ذہن میں یہ بات بھی کلبلائی کہ ممکن ہے اس عمل سے اس کی گمشدہ حس واپس آجائے۔ یہ تو میں اچھی طرح جانتی ہی ہوں کہ اس کا یہ عمل ارادی نہیں بلکہ غیر ارادی طور پر سرزد ہوا ہے، لیکن اس وقت دیر تک

اس عمل کا یونہی برقرار رہنا اہم ہے...... ممکن ہے وہ اس سے آگے بھی بڑھے۔

غیر ارادی طور پر ہی سہی......

شاید وہ آگے بڑھ ہی جائے......

میں دم سادھے اس بات کی منتظر رہتی ہوں۔

کچھ نہیں ہوتا...... بہت دیر تک کچھ نہیں ہوتا۔ صرف یہ کہ میرے ذہن میں ایک چھنا کا سا ہوتا ہے اور ایک عجیب و غریب بلکہ لطیف احساس عدم تحفظ مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔

کیا میں کوئی ایسی چیز ہوں جس کا دامن پکڑ کر آسانی سے کوئی گریبان تک جا پہنچے؟

اس چھنا کے کے بعد بھی فوراً یہ ہونا چاہئے تھا کہ میں اسے ایک طرف کو ڈھکیل کر اٹھ کھڑی ہوتی......

یہ بھی نہیں ہوا اور میں بار بار اپنے آپ کو سمجھاتی ہوں کہ اس نے جان بوجھ کر تو اپنا ہاتھ میرے سینے پر نہیں رکھا، ورنہ ایک ہی مقام پر ایک خاص زاویے سے اتنی دیر تک وہ رکا تو نہیں رہ سکتا تھا۔ فی الحال کچھ سوچنے یا کسی ردعمل کے فوری اظہار کی ہرگز ضرورت نہیں، ابھی صرف یہ دیکھنا ہے کہ آگے کیا ہوتا ہے۔

میں نے اپنے جسم پر کئی کپڑے چڑھا رکھے ہیں۔ انڈرویر کے علاوہ شلوار قمیض کے نیچے ایک موٹا سایہ بھی ہے۔ اوپری حصے کو بھی میں نے دوپٹے سے لپیٹ رکھا ہے، اس کے ہاتھ کی گرمی بے شک میرے اندر نہیں پہنچ رہی ہے صرف ایک دباؤ...... جو مجھے نئے جہانوں کی سیر کرا رہا ہے۔ میں بہت بے چینی سے منتظر ہوں کہ اس کے دوسرے ہاتھ اور اعضا بھی غیر ارادی حرکت کریں اور میرے جسم سے مس ہوں...... کچھ نہیں ہوتا اور میں یونہی پڑی رہتی ہوں۔

بہت دیر کے بعد مجھے احساس ہوتا ہے کہ اس کا جو ہاتھ میرے سینے پر دھرا ہے، اس کے دباؤ میں ایک خاص قسم کی یکسانیت ہے...... دباؤ بھی نہیں، ایک مردانہ ہاتھ کا بھاری پن......

میں آہستہ سے اس کے ہاتھ کو اٹھانا چاہتی ہوں۔

ایک طاقتور سانپ مجھے ڈس لیتا ہے۔

اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں جھول جاتا ہے، میں گھبرا کر چھوڑ دیتی ہوں تو وہ بے جان سا ہو کر نیچے گر پڑتا ہے۔ میں جلدی سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتی ہوں۔

وہاں کچھ بھی نہیں ہے ایک سرد لہر کے سوا جو میری ہڈیوں میں سرایت کرتی جاتی ہے۔

(۱۲)

میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میں اب وہ نہیں رہی، جو تھی۔ میرے جسم میں لاتعداد سوئیاں چبھو دی جائیں تب بھی کچھ فرق نہیں پڑنے والا...... میرے جسم کے اندر تیز کرنٹ دوڑا دی جائے تب بھی وہ چیز نہیں ہو سکتی جو میری اپنی تھی۔

اس احساس نے کہ ایک مُردے کے لمس سے میں حظ اٹھاتی رہی، قیامت تک کے لئے مجھے مار دیا ہے۔ اس مُردے کے ساتھ میری تمام چیزیں جل چکیں اور اب جو کچھ بھی باقی ہے، وہ بھی شمشان گھاٹ جانے کو تیار۔

اگر میں زندہ ہوں تو مردہ سے بھی بدتر......

مردہ ہوں تو زندوں سے میرا کیا کام......

میرے اندر جو زبردست جنگ چل رہی تھی اور ہر بار میں یہ سمجھتی رہی کہ جنگ میں نے جیت لی ہے تو یہ میرا بھرم تھا، دراصل تمام جنگیں میں ہارتی رہی تھی، سارے محاذ پر میں ہار گئی......

اب کیسے جیوں، کہاں سے جیوں......؟

ایک شکست خوردہ کو وہ سنگھاسن پر بٹھانا چاہتے ہیں، اب میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ......

✠ • ✠ • ✠

سحر البیانی

ہمارا سفر عجیب بھی تھا اور عجیب نہیں بھی۔

عجیب ان معنوں میں کہ ہمیں پتہ نہیں تھا ہماری منزل کیا ہے بلکہ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ راستے میں ہمیں کیا درپیش آئے گا اور اس کے لئے ہمیں کیا تیاری کرنی چاہئے۔ نتیجہ یہ کہ کوئی تیاری نہیں کی تھی ہم نے اور بس چل پڑے تھے اور یہ سفر عجیب یوں نہیں تھا کہ صرف صفدر حسین مظہری کو یہ پتہ تھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ وہی ہمارے راہ بر تھے اور انہیں پر بھروسہ کر کے ہم چل پڑے تھے۔ دراصل ایسے سفر پر ہماری آمادگی ہی صفدر حسین مظہری کی سحر البیانی اور ہر حال میں قائل کر دینے کی قوت کی ایک بہت بڑی مثال تھی ...... ان کی کامیابی کا مظہر۔ ہم جو اپنی کاہلی اور سستی کے لئے زمانے بھر میں مشہور تھے، ہم چھ چھ مہینے سر کے بال اور ہفتہ ہفتہ بھر شیو اس لئے نہیں کراتے تھے کہ اس کے لئے سیلون جانے کی زحمت اٹھانا پڑتی تھی۔ لوگ سمجھتے کہ ہم نے فیشن میں اتنے بڑے بڑے بال رکھ چھوڑے ہیں اور کسی فلم ایکٹر کی نقل میں بے ترتیب داڑھی چھوڑ دی ہے۔ ہمارے کپڑے بھی مہینوں دھلے بغیر رہتے، اگرچہ یہ چیز بھی فیشن میں ہی مانی جاتی۔ جینز کو زیادہ دھونا ان کی زندگی کو کم کرنے کے مترادف ہے۔ ہم روز نہاتے بھی نہیں تھے، ہماری کاہلی اور سستی کی یوں بہت سی مثالیں تھیں لیکن آفریں ہے صفدر حسین مظہری پر کہ انہوں نے ہمیں اس سفر کے لئے آمادہ کر ہی لیا، وہ بھی ایک ایسے سفر کے لئے جس کی منزل کا صرف انہیں پتہ تھا اور کسی کو نہیں۔

اس سفر کی کچھ اور باتیں بھی عجیب تھیں مثلاً اس کے لئے جو گاڑی طے کی گئی اسے نہ تو کار کہہ سکتے ہیں نہ بس بلکہ دونوں کے بیچ بیچ کی کوئی چیز، شاید کسی چھوٹے ٹرک کا ڈھانچہ تخلیقی ذہن رکھنے والے کسی من چلے مستری کے ہاتھ لگا اور اس نے اپنی کاریگری سے اسے سڑک پر دوڑنے

والی کوئی چیز بنا دی۔ اتفاق سے یہ چیز صفدر حسین مظہری کے ہاتھ لگی اور انہوں نے اسے ہمارے ساتھ سفر میں جھونک دیا۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے سارے ہم سفر ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی تھے۔ گاڑی کے اندر تاریکی رہنے کے سبب ہم ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے، لیکن سرگوشیوں میں جو کچھ ہمارے کانوں میں پہنچ رہا تھا اسے ہم سمجھ ضرور رہے تھے۔ مگر ہم سے وہی زبانیں بولنے کو کہا جاتا تو ہم نہیں بول پاتے۔ اس سفر میں یہ بھی علم ہوا کہ جو بات سمجھی جاتی ہے ضروری نہیں کہ وہ بولی بھی جائے۔ صفدر حسین مظہری کا یہ ہنر بھی ہم پر کھلا کہ وہ جو کچھ سمجھتے تھے وہ بول بھی سکتے تھے۔ اس سے ان کے رعب کا ایک اور ردا ہم پر پڑا۔

سفر شروع کرتے ہوئے جس راستے پر ہماری گاڑی چلی، ایسا راستہ ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ سست اور کاہل ہوتے ہوئے بھی ہم اپنے اطراف کے جغرافیہ سے اچھی واقفیت رکھتے تھے، جب بھی اس موضوع پر کوئی گفتگو ہوتی ہم اپنی علم دانی کا ضرور مظاہرہ کرتے، پر یہ راستہ...... ٹیڑھے میڑھے کھیت، اونچے نیچے میدان اور غیر مسطح پہاڑیاں...... اس راستے کی کوئی کل درست ہی نہیں تھی، گاڑی یوں اچھل رہی تھی جیسے کوئی ناسمجھ بچہ اپنے کھلونے سے کھیل رہا ہو۔ اب سمجھ میں آیا کہ صفدر حسین مظہری نے ایسے راستے کے لئے اسی گاڑی کا انتخاب کیوں کیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا سفر اختیار ہی کیوں کیا گیا، انہیں تو پہلے ہی سے پتہ ہوگا کہ......

مگر سوال جواب کا موقع تو ہم قبل ہی گنوا چکے تھے۔ یہ موقع تب تھا جب صفدر حسین مظہری ہمارے ذہنوں کے سادے سلیٹ پر اپنی باتیں لکھ رہے تھے۔ اس وقت ہم ان کی باتوں میں ایسا کھوئے کہ سوچنے سمجھنے کی ساری سدھ بدھ گنوا بیٹھے، اب جب کہ ہم حالت سفر میں تھے، کسی قسم کے سوال جواب کا کوئی تک بھی نہیں تھا، سو ہم صبر و شکر کے ساتھ بیٹھے رہے۔

سرگوشیاں ہو رہی تھیں، درمیان میں خاموشی کے وقفے بھی آتے لیکن ایک بات واضح تھی، کوئی چہک رہا تھا، صرف صفدر حسین مظہری، بہت خوش خوش باتیں کر رہے تھے ان کے اسٹاک میں باتیں بھی بہت تھیں۔ ان کے پاس ماضی کے بوسیدہ پھول ہی نہیں تھے، مستقبل کی تر و تازہ اور مہکتی ہوئی کلیاں بھی تھیں۔ وہ کیا باتیں کر رہے تھے، وہ سب کی گرفت میں بھی نہیں آ رہی تھیں پر وہ باتیں تھیں بہت دلچسپ، ہمیں سنتے ہوئے بہت اچھا لگ رہا تھا، لیکن باتیں ہزار خوبصورت ہوں کوئی آخر کب تک سنتا رہے۔ صفدر حسین مظہری بھی کس دھات کے بنے تھے، بس اپنی دھن

کے بکے۔ وہ اپنی کہے جا رہے تھے، انہیں قطعی پروا نہیں تھی کہ راستہ بے حد ناقص ہے، دھول اٹھتی ہے تو سامنے بگولہ سا بن جاتا ہے اور ہم سب بار بار دھول سے نہا جاتے ہیں، ایسے میں صفدر حسین مظہری کی باتیں کبھی کبھی ناگوار بھی گذرتیں۔

صفدر حسین مظہری یوں بڑے چاق و چوبند آدمی تھے، بڑے ہوشیار اور زمانہ شناس، وہ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے اور ایک اچٹتی نگاہ میں آدمی کو پہچان جانے کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن ہمیں بار بار ان کی عقل پر رونا آتا رہا کہ تمام چیزوں سے بے نیاز وہ اپنی دھن میں اپنی باتوں میں لگے ہیں۔ انہیں اس کی ذرہ بھر پروا نہیں تھی کہ جس سفر کو کامیاب اور خوبصورت بتایا اس میں دھچکوں اور دھول سے سارے مسافر عاجز آ چکے ہیں اور اس وقت ان کی باتوں کی نہیں، اس کی ضرورت ہے جو ان کی کوفت کا مداوا کر سکیں۔

تھکاوٹ اور اکتاہٹ تو تھی ہی اب بھوک، پیاس نے بھی دھیرے دھیرے ہمیں گھیرنا شروع کر دیا، جب وہ چاروں طرف سے اپنے چنگل کس لیں گے، تب کیا ہوگا۔ پتہ نہیں کھانے پینے کا سامان بھی راستے میں میسر آ سکے گا یا نہیں، اس وقت ایک کمال دیکھنے میں آیا۔ صفدر حسین مظہری نے اپنی دھن کے باوجود ہمارے اندر اٹھتے ہوئے جارحانہ نعروں کو سن لیا اور بڑی دل آویزی سے مسکرائے۔

''بھوک......؟''

سب کے چہرے پر اچانک روشنی سی آ جانے پر اندر کی تاریکی کچھ کم ہوئی، لیکن یہاں کھانا کہاں...... دور دور تک تو بس صحرا تھا اور اوبڑ کھابڑ راستے، دھول بھری فضا...... گاڑی ہچکولوں سے اتنی ہم آہنگ ہو چکی تھی کہ کہیں کہیں پر اتفاق سے کچھ اچھا راستہ بھی آ جاتا تو بھی گاڑی کی چال میں کوئی فرق نہیں آتا۔

صفدر حسین مظہری آگے کی جس سیٹ پر بیٹھے تھے، اس کے نیچے سے انہوں نے گتے کا ایک ڈبہ کھینچا، دبیز کاغذ کی طشتریاں نکالیں اور کھانے کی خشک چیزیں سب کے درمیان تقسیم کر دیں۔ کھانے پر ہم سب ٹوٹ پڑے۔ واقعی ہم نے ان پر جو بھروسہ کیا تھا تو کچھ غلط نہیں تھا۔

''پانی......؟''

خشک کھانا حلق میں اٹکنے لگا۔

''ہے بھائی......وہ بھی ہے......''

پانی کا ڈرم بھی موجود تھا اور گتے کے چھوٹے چھوٹے گلاس بھی، واقعی وہ بڑے دور اندیش تھے۔ اب ہم مطمئن ہو کر پھر ان کی باتوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ راستہ وہی ناہموار اور گاڑی کی چال پہلے کی طرح تکلیف دہ، لیکن ان کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں، صفدر حسین مظہری کسی جادوئی مقام کا منظر کھینچ رہے تھے۔

......''ہرا بھرا باغ، ہریالی جس کی کبھی ختم نہ ہو، پھولوں پر کبھی خزاں کا سایہ نہ پڑے، پتیاں کبھی پیلی نہ ہوں، پیڑ مرجھانے کی طرف کبھی مائل نہ ہوں، ہر موسم میں سدا پھل دیتے رہیں، پھل ہمیشہ میٹھے ہوں، ترش مزاج والے پھل بھی اپنی ترشی کو ہمیشہ کے لئے تج دیں اور......اور...... پانی ایسا میٹھا کہ شربت کا گمان ہو......شربت جو صحت پر منفی اثر نہ ڈالے...... صحت بخش......موسم ایسا کہ نہ بہت زیادہ ٹھنڈا نہ بہت زیادہ گرم......ایسا معتدل جس کا تصور بھی نہ ہو، ہوائیں ایسی خوش گوار جو دل و دماغ تک کو معطر کر دیں...... بدن کی سستی کو دور کر دیں......''

گاڑی جنگل سے گذر رہی تھی، باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ چلتے چلتے راستہ سا بن گیا تھا۔ گاڑی کی اچھل کود بہت بڑھ گئی تھی، سارا کھایا پیا منہ کو آتا ہوا محسوس ہوتا تھا لیکن صفدر حسین مظہری کی مسحور کن باتیں...... ان باتوں میں ایسا جادو تھا جو سر چڑھ کے بولتا تھا، ایسی باتیں پہلے ہم نے کبھی نہیں سنی تھیں اور وہ اس طرح بیان کرتے تھے جیسے انہوں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہو۔ وہ ہمیں یہ بھی یقین دلاتے تھے کہ ہم بھی ضرور اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔

راستے میں جنگلی جانور سامنے آکر غراتے، شاید انہیں گاڑی کے چلنے کی آواز دوسری غراہٹ کے مشابہ نظر آتی، دونوں کی غراہٹ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی، کبھی وہ خود ہی راستہ چھوڑ دیتے۔ کبھی کوئی ضدی جانور اڑ جاتا تو گاڑی کو اپنے اوپر تیزی سے چڑھتا دیکھ کر بھاگنے پر مجبور ہو جاتا۔ ہماری گاڑی چاروں طرف سے بند تھی اس لئے کسی جانور کے چڑھ آنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ پھر گھنے جنگل سے عجیب عجیب آوازیں آنے لگیں، کبھی ڈرم پیٹنے کی، کبھی تیز چیخ، کبھی دل خراش ہنسی...... سب نے ڈر کر اپنی گودوں میں اپنے منہ چھپا لئے۔ صفدر حسین مظہری بالکل نہیں ڈرے، ڈرائیور کی ہمت بندھاتے ہوئے انہوں نے کھڑکی کے شیشے تھوڑا نیچے کر لئے اور ان آوازوں کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔

اوران آوازوں کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔

''ہانکا......!''

کچھ دیر کے بعد انہوں نے اطلاع دی۔ ان کی بات ہماری سمجھ میں نہ آئی۔

''ہانکا......؟؟؟......''

کئی ہونٹوں پر ایک جیسا سوال مچل کر رہ گیا۔

''ہاں......ہانکا......شکار کے لئے......جانور کو ہڑکانے کے لئے......''

وہ خاصے بے پرواتھے۔

''اگر......؟؟''

''اگر کیا......؟''

''یہ ہانکا نہ ہوا تب......؟''

''پھر......؟ پھر کیا ہو سکتا ہے......؟''

انہوں نے گھوم کر ہماری طرف دیکھا۔ ہم سب دبک گئے۔ ان کی آنکھوں میں جیسے شیر کی چمک تھی۔ ہم یقین کرنے پر مجبور ہوئے کہ وہ ہانکا ہی تھا۔

یہ اور بات ہے کہ بہت دیر تک ہم یہ محسوس کرتے رہے کہ ہانکے کے مرکزی کردار کہیں ہم ہی نہ ہوں......لیکن ڈرنے کی کیا بات تھی، صفدر حسین مظہری ہمارے ساتھ تھے۔

ہانکا بہت دور تک ہمارا پیچھا کرتا رہا......طرح طرح کی آوازیں......کبھی کبھی بہت ڈراؤنی آوازیں بھی......جیسے آندھی بے شمار بانسوں کی سرنگ میں گھس کر اپنا سفر طئے کر رہی ہو، کوئی دم میں جب یہ آندھی بانسوں سے نکل آئے گی تو ایک خوف ناک آدم خور چڑیل کی شکل اختیار کرلے گی۔ کبھی محسوس ہوتا بہت سے لکڑ بگھے ہنس رہے ہیں، ان کی ہنسی سے ایک طوفان بپا ہے۔ کبھی گانے کی آوازیں......کبھی رونے کی......کبھی یہ آوازیں خوش گوار بھی ہو جاتیں اور کانوں کو بھلی لگتیں، لیکن بہت کم وقفے کے لئے، اگر چہ یہ وقفہ بھی غنیمت تھا کہ لگا تار نحوست کے بوجھ تلے یہ وقفہ تنور کے نیچے......بہت نیچے ایک بہت چھوٹے روزن کی طرح تھا جس سے ٹھنڈی ہوا کی ایک پتلی لکیر اندر آجاتی تھی۔

ہمارے ذہنوں میں سوالوں کا ایک میدان کارزار کھلا ہوا تھا۔ لیکن لبوں پر سخت پہرہ پڑا

تھا۔ سوالوں کے جواب اگر تھے تو صرف صفدر حسین مظہری کے پاس، اور وہ ایک بار گھوم کر ہمیں گھور چکے تھے۔

اسی درمیان ایک بات اور یہ ہوگئی کہ ہم سب آپس میں لڑ پڑے۔ اچانک ہمیں محسوس ہوا تھا کہ ہمیں انفرادی طور پر جتنی جگہ ملنی چاہئے تھی نہیں ملی، سفر کے شوق اور صفدر حسین مظہری کی سحر البیانی نے اس وقت کچھ سوچنے سمجھنے کے لائق کہاں رکھا تھا۔ ہم ایک نسبتاً چھوٹی گاڑی میں دھنسے ہوئے تھے۔ گاڑی اتنی چھوٹی بھی نہیں تھی، ہم زیادہ تھے بلکہ بہت زیادہ اور گنجائش سے زیادہ جگہیں گھیر کر ایک دوسرے کے اوپر لدے پڑے تھے۔ کسی کا ٹخنہ کسی کے پیٹ میں گھس رہا تھا، کسی کا سر کسی کے کاندھے سے ٹکرا رہا تھا، کسی کا ہاتھ کسی کے ران پر دباؤ ڈال رہا تھا، کسی کی بدبودار سانسیں کسی کے منھ میں گھس رہی تھیں...... ہر شخص تھا کہ ایک دوسرے پر چڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس پس منظر میں پہلے دھکا مکی شروع ہوئی، پھر باقاعدہ سر پھٹول...... تعجب ہے کہ اس کام میں اتنی تاخیر ہوئی، ہم سب صفدر حسین مظہری کی سحر البیانی میں اس قدر کھو گئے کہ باقی کسی چیز کا خیال ہی نہیں رہا، ہم پہلے سحر زدہ ہوئے، پھر ان کے سامنے سر تسلیم خم کیا، پھر ان کے کہنے پر اس سفر کو اختیار کیا...... سب کا دشمن ایک دوسرے کے سامنے تھا، آگے، پیچھے، اوپر، نیچے، دائیں، بائیں...... کوئی جگہ بھی تو دشمن نے خالی نہیں چھوڑی تھی۔ اندر گھپ اندھیرا تھا ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون کس کو پیٹ رہا ہے۔ یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ کس کے پاس کون بیٹھا ہے۔

اس صورت حال سے صفدر حسین مظہری پر کوئی ضرب نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ آگے کی سیٹ پر تنہا بیٹھے تھے۔ وہاں پر بیٹھنا ان کے لئے اس لئے ضروری تھا کہ صرف انہیں پتہ تھا ہمیں کہاں جانا ہے۔ پھر ان کے ساتھ کھانے پینے کے سامان بھی تھے۔ لیکن ہماری بدسلیقگی انہیں ہرگز اچھی نہیں لگی اور وہ ہم پر لعنتیں بھیجنے لگے۔

"کمال ہے یار، یعنی اب تک آپ لوگوں کو ہوش نہیں آیا......؟ یہ پرخطر راستہ، چاروں طرف کی اتھاہ تاریکی، مخدوش سواری، چاروں طرف ہانکے، ممکن ہے ہم اس کے ذریعہ گھیرے جا رہے ہوں اور آپ ہیں کہ......"

کیا کہہ رہے ہیں مظہری صاحب......؟

لمحہ بھر کے لئے ہم سب کچھ بھول کر بے خود سے ہو گئے۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ ہی تو ہمیں وہاں لے جا رہے ہیں......؟''

تاریکی میں آواز کا ایک جگنو چمکا۔

''بے شک......لیکن میں نے راستے کی بات تو نہیں کی تھی......''

اس دوٹوک جواب کے بعد سناٹا چھا گیا۔ بات صحیح تھی، انہوں نے راستے کی بات کہاں کی تھی۔ بلکہ انہوں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ان کا وعدہ وہاں لے جانے کا تھا اور وہ وہاں لے جا رہے تھے۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد پھر دھکم پیل......انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''بھیا، تم نہیں مانتے تو یہ سفر یہیں ختم کر دیا جائے......؟''

ختم......؟

یہاں......؟

یعنی......؟

''یہیں رک کر، اتر کے ہم کہیں بکھر جائیں......''

ان کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

ہانکا مسلسل پیچھا کر رہا تھا۔ کوئی سامنے نہیں آیا تھا لیکن اس کا سامنے نہ آنا زیادہ خطرناک تھا......

واپسی کا......اتر کے بکھر جانے کا مطلب تھا......

کوئی ایک نہیں، اس کے بے شمار مطلب تھے، ہر مطلب سے کئی کئی مطلب پھوٹ رہے تھے۔

اس دھمکی کا فوری اثر یہ ہوا کہ لڑائی رک گئی۔ یہ جنگ بندی عارضی رہی۔ جن سے لڑائی ہو رہی تھی وہ تو بالکل پاس ہی تھے اور وہ وجوہات بھی......تھوڑی دیر کے بعد پھر کیل سی چبھنے لگی۔ صفدر حسین مظہری نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا حکم دیا، ہم سب کی نگاہیں ان پر ٹک گئیں گاڑی رک تو گئی تھی لیکن کوئی نیچے اتر نہیں رہا تھا، صفدر حسین مظہری اور ڈرائیور بھی نہیں جنگل کی تاریکی کچھ اور گھنی ہو گئی تھی، جنگلی جانوروں کی خوفناک دھاڑیں قریب آ گئی تھیں، ہانکے کی طرح طرح کی آوازیں بھی دور نزدیک سے اپنا گھیرا ڈال رہی تھیں۔ سب گم صم تھے۔

اس سنسان گھنے، پرخطر جنگل میں انہوں نے گاڑی کیوں رکوادی..........

انہوں نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ تو نہیں پہنادیا..... اترو اور بکھر جاؤ۔

نہیں..... وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ ہمیں یوں نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم میں سے کسی کو بھی آگے کا راستہ نہیں معلوم، بھاگنے کا بھی کوئی راستہ نہیں، واپسی کے راستے بھی معدوم کہ سارے راستوں کی خبر تو صرف صفدر حسین مظہری کو ہے، وہی تو ہمیں یہاں تک لائے ہیں، وہ ہمیں یوں بیچ منجھدار میں نہیں چھوڑ سکتے۔

خطرہ بالکل ہمارے سر پر آ گیا تھا۔ جنگلی جانوروں کی دھاڑیں اور قریب آ گئی تھیں، شاید انہیں ہماری خبر ہو گئی تھی۔

صفدر حسین مظہری خاموش بیٹھے تھے، ان کی خاموشی اور ہماری خاموشی میں بہت فرق تھا، ہم پر خاموشی لادی گئی تھی، انہوں نے اپنی مرضی سے اختیار کی تھی۔

''گاڑی آگے کیوں نہیں بڑھتی......؟''

ہم میں سے کوئی منمنایا۔ صفدر حسین مظہری پرسکون لہجے میں بولے۔

'فائدہ کیا ہے......؟ آپ لوگ تھوڑی سی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ آپس کی قربت آپ کو چبھنے لگتی ہے، وہاں جا کر تو آپ حسد اور رقابت میں مبتلا ہو جائیں گے......''

اتفاق سے اس وقت ان کی تنبیہ کا ٹھیک وہی اثر ہوا جو ان کی سحر البیانی کا ہوا تھا۔ سب خاموش ہو گئے، یوں خاموش پہلے بھی تھے لیکن اب ایک دوسرے کو برداشت بھی کرنے لگے۔ اتنا کچھ ہونے پر ہماری جغرافیائی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، اصل میں جغرافیہ ہمارے درمیان اپنا مطلب کھو چکا تھا، ہم چاہتے بھی تو اس میں کوئی فرق نہیں آتا۔

صفدر حسین مظہری ہماری خاموشی سے متاثر ہوئے اور ان کے حکم سے گاڑی پھر چلی۔ طوفان تھمنے کے بعد خاموشی انہیں بہت راس آئی اور ان کی سحر البیانی نے پھر اپنے جوہر دکھانے شروع کر دئے۔

جنگل ختم ہوا تو ویرانہ شروع ہو گیا۔ دور دور تک جہاں نگاہ جاتی بالوؤں کے بگولے اڑتے تھے۔ گاڑی کے سارے شیشے تو شروع ہی سے بند تھے۔ آگے کا شیشہ صفدر حسین مظہری کے قبضۂ اختیار میں تھا، وہ موقع مصلحت کے مطابق اسے چڑھاتے اتارتے رہتے۔ کبھی کبھی تو بگولے

اتنے مشتعل ہو جاتے کہ شیشوں پر چھن چھن آ کر گرتے۔ گاڑی میں جو بہت چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے وہ بالوؤں کے لئے محفوظ Passage بنے ہوئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں بالوؤں سے سب کے کپڑے، بال، کان، ناک...... بھر گئے، کچھ مہین ذرے ہماری آنکھوں میں بھی آ گھسے۔ اس آفت کا کوئی سدباب نہیں تھا سوائے اس کے کہ جتنی جلد ممکن ہو اس ویرانے سے نکل جایا جائے۔ اگر خدانخواستہ گاڑی کسی وجہ سے رک جاتی تو یہ دیکھتے دیکھتے بالوؤں سے نہا جاتے۔ صفدر حسین مظہری اب بھی اپنی سحر البیانی میں مصروف تھے، شاید ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ یہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے، فی الوقت تو کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے، لیکن ہم اب ان کی باتوں سے بالکل محظوظ نہیں ہو رہے تھے۔ ہمارے کانوں میں میٹھے بول ضرور پڑ رہے تھے لیکن ہمارے دماغ کچھ اور سوچنے میں مصروف تھے، ایک تو ہم دس کی جگہ سو تھے، دوسرے ہم پر ان چھوٹے ذروں کی مار پڑ رہی تھی جن سے ہم اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے صفدر حسین مظہری کے کہنے پر آپس کی لڑائی بھی بند کر دی تھی، لیکن وہ تو کچھ بھی نہیں کر رہے تھے، کچھ کرنے کی ذمہ داری تو سو فیصد انہیں کے سر آتی تھی۔ آخر ان کے کلام کو قطع کرتے ہوئے ہم نے درخواست کی کہ کسی طرح اس مصیبت سے ہمیں نجات دلائیں کیونکہ ہم سے زیادہ وہی بہتر جانتے ہیں۔ وہ چپ ہو گئے، چند لمحے تک کچھ سوچا کئے، پھر ہمیں سمجھاتے ہوئے بولے۔
''یہ تو راستہ ہے نا، راستے کی تکلیف تو ہمیں برداشت کرنی ہی پڑے گی، راستے پر تو کسی کا اختیار نہیں ہے......''

بات تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ ان کے پاس کوئی ایسا منتر تو تھا نہیں کہ وہ ان رکاوٹوں کو پلک جھپکتے میں دور کر دیں۔ بس ایک ہی راستہ تھا اور وہ بھی بالکل سامنے کا کہ گاڑی جس طرح چل رہی ہے، چلتی رہے۔ یہ ویرانی ختم ہو تو شاید......

کچھ دیر کے بعد یہ ویرانی واقعی ختم ہوئی۔ صفدر حسین مظہری کی روانی ٹوٹ گئی۔ وہ اپنے روایتی سکون اور بشاشت کے ساتھ مسکرائے۔

''آپ لوگ فوراً ہی گھبرا جاتے ہیں، ذرا سوچئے اس ویرانے میں آپ کی گاڑی خراب ہو جاتی اور آپ یہاں اترنے پر مجبور ہو جاتے تو......؟''

ان کی یہ بات بھی صحیح تھی۔ ہم تو تصور کر کے ہی کانپ اٹھے۔ ابھی گاڑی جس راستے سے

گذر رہی تھی وہ راستہ ہزار اوبڑ کھابڑ سہی، ہمیں کسی طرح آگے تو لئے جا رہا تھا۔

دور دور تک دو رویہ جنگلی درختوں کا سر سبز سایہ جن کے بڑے بڑے پتوں سے چھن کر سورج کی تیز کرنیں ساری فضا کو روشن کر رہی تھیں۔ اس وقت صفدر حسین مظہری کی باتیں نہ صرف ہمیں بلکہ ہماری روحوں تک کو سرشار کرنے لگیں، شاید ہم جھوم بھی رہے تھے۔ گاڑی کی ساری کھڑکیاں کھل گئی تھیں جس سے اندر کی فضا بھی روشن تھی، ہم نیم وا آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ عجب عجب شکلیں، انجان رنگوں کے لباس، ایک دوسرے سے بالکل مختلف زبان انداز...... ہمیں تعجب تھا کہ ہم اتنی دیر سے بالکل اجنبیوں کے درمیان سفر کرتے رہے، دوسرے لڑتے بھی رہے۔ اب بھی کسی کا ٹخنہ کسی کے پیٹ میں، کسی کا سر کسی کے کاندھوں پر، کسی کا ہاتھ کسی کے ران پر، کسی کی سانسیں کسی کی سانسوں میں مدغم ہو رہی تھیں...... تضاد میں تضاد...... ان سب کو ایک ساتھ لے کر چلنا صفدر حسین مظہری کا کمال ہی تھا، واقعی وہ یکتائے روزگار تھے۔ صرف سحر البیانی ہی ان کا وصف نہیں بلکہ علم کے کئی دریا ان کے اندر پھوٹے تھے اور پوری روانی کے ساتھ بہہ رہے تھے۔ کم سے کم ہمارے جیسے تنکے تو اس میں آسانی سے بہہ سکتے تھے اور بہہ رہے تھے۔

ہم...... حقیر تنکے......

ہمارے اندر کی ساری ندیاں چھوٹی چھوٹی نالیوں میں تبدیل ہو کر صرف خشک نہیں بلکہ ویرانے میں بدل چکی تھیں۔ ہم نے اپنے علم کے منبع کو خوبصورت کپڑوں میں لپیٹ کر اپنے گھروں کی طاقوں میں سجا رکھا تھا۔ صفدر حسین مظہری اپنی سحر البیانی اور بے پایاں علم کے سہارے ہمیں ایسی جگہ لے چلے تھے جس کا علم صرف انہیں تھا تو یہ ان کا حق تھا۔

کھلی کھڑکیوں سے کسی شاداب درخت کے پتے ہمارے کانوں کو چھو جاتے اور کسی مہربان پیڑ کے پھل ہمارے لبوں کو چوم جاتے۔ صفدر حسین مظہری سچ کہتے تھے، راستوں پر ان کا کیا اختیار تھا، راستے کبھی خراب بھی آجاتے ہیں، کبھی اچھے بھی۔ اب کتنا اچھا راستہ آگیا تھا، اس کے سبب ہمیں محسوس ہونے لگا کہ اب ہم اس جگہ سے کافی قریب ہیں۔ اس جگہ سے، جس کی ایک موہوم سی تصویر ہمارے ذہنوں میں تھی۔ اس کی سچی اور سہی تصویر تو صرف صفدر حسین مظہری کے پاس تھی۔ ان کے پاس کھانے پینے کے سامان بھی وافر تھے اور وہ بدل بدل کے ہمیں دیتے بھی رہے اور ہم صدق دلی سے ان چیزوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ راستے میں دو ایک جگہ ہم

رکے بھی، ضروریات سے فارغ ہوئے، تازہ ہوا پھیپھڑوں میں بھرلی، نئے سرے سے پہلو بدلے اور تازہ دم ہولئے۔

خوشیوں کی یہ وادیاں بھی ختم ہوئیں اور ہم ایک بار پھر ایک بالکل نئے اور اجنبی راستے سے دوچار ہوئے۔ اس میں خیاباں نہیں تھا، صحرا تھا، کہیں کہیں جنگل بھی، لیکن سارے کے سارے درخت گرد آلود، ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے ہوئے، روشنی اور ہوا کو نیچے آنے سے روکتے ہوئے......ان درختوں پر نظر ڈالتے ہوئے خوف سا محسوس ہوتا تھا۔ ان کے پتوں میں جو ہوا چھنتی تھی، اس کا دم گھٹتا تھا اور ان کے حلق سے پھنسی پھنسی خوفناک آوازیں نکلتی تھیں۔ ان تاریکیوں میں سورج کی جو کرنیں مچلتی تھیں، وہ زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی ڈراونی تصویریں بن جاتی تھیں۔ یہ جنگل جن صحراؤں کے چنگل میں تھے وہ اپنی ویرانی سے پچھلی ساری ویرانیوں کو بہت پیچھے چھوڑ گئے تھے، ہوائیں وحشیوں کا تانڈو کر رہی تھیں اور صحرا کی ساری ویرانیوں کو اپنی انگلیوں پر نچا رہی تھیں، جنگل اور صحراؤں کے درمیان جو راستہ تھا وہ اس قدر زخم خوردہ تھا کہ اسے جہاں سے چھوا جاتا وہ چیخ پڑتا۔ ہم گم صم، سہمے سہمے سے تھے۔ ہماری ویران آنکھیں ایک دوسرے کو دیکھ نہیں رہی تھیں بلکہ ہماری پتلیوں میں ایک دوسرے کی بے جان، خاموش تصویریں لرز رہی تھیں۔ گاڑی کی رفتار بہت بے ہنگم تھی، ایسا لگتا تھا کہ اسے کوئی چلا نہیں رہا بلکہ کوئی غیر مرئی طاقت اپنی مطلق العنانی کے زعم میں اسے اچھالتی جا رہی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ صفدر حسین مظہری بھی بے بس، خاموش بیٹھے تھے۔

حالات کا مردانہ وار سامنا کرنے والا، انوکھے، انجانے واقعات پر سواری کرنے والا، بے پناہ خوشیوں میں اپنے قہقہوں پر قابو رکھنے والا، نامساعد حالات میں اپنی مسکراہٹوں کو آزاد چھوڑ دینے والا، اپنی سحر البیانی اور خوبصورت باتوں سے دماغوں اور سوچوں پر قبضہ جما لینے والا، پچھلے اور اگلے علوم اور جانکاری کا منبع صفدر حسین مظہری شاید چپکے سے کہیں اتر گیا تھا اور جو شخص اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا، وہ ہم سے بہت مختلف نہیں تھا، ہماری طرح چپ چاپ، بدحواس، گم صم، کچھ نہیں جاننے والا، دوسروں کے اشارے پر ناچنے والا، حالات کے بہاؤ میں تنکے کی طرح بہنے والا......

ابھی ہم اس نئے شخص کو ٹھیک سے پہچان بھی نہیں پائے تھے کہ اچانک کالی آندھی نے

ہمیں آلیا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دینے لگا، گاڑی ایک ڈوبتی کشتی کی طرح بری طرح ڈگمگا رہی تھی۔ ڈرائیور گاڑی روکنا چاہتا تھا لیکن اب یہ اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ اس مطلق العنان نے گاڑی پر اپنا مکمل قبضہ جما لیا تھا اور اب اسے اپنی مرضی کے مطابق لے جا رہا تھا۔ ہم سب اس کی قید میں تھے۔ صفدر حسین مظہری بھی۔

یکا یک محسوس ہوا کہ زمین بری طرح ہلی یا شاید کالی آندھی کی جابرانہ مسلسل سواری سے کراہ اٹھی۔ ہر چہار طرف سے دھماکوں کی آوازیں آنے لگیں اور ہماری گاڑی کو کسی نے اٹھا کر جیسے جھولے پر رکھ دیا۔

''......''

صفدر حسین مظہری کچھ بڑبڑائے۔

ان کے بڑبڑانے سے ہمارا وہ سکوت ٹوٹا جو موت کی خاموشی سا ہم سے چمٹ گیا تھا، ہمیں محسوس ہوا کہ ابھی ہم کچھ سن سکتے ہیں۔ جن حالات میں ہم گھر گئے تھے، ان پر ہمارا کوئی بس نہیں تھا، ہم کچھ کر نہیں سکتے تھے ہمارے پاس کچھ تھا نہیں ایک صفدر حسین مظہری کے سوا......

''اب کیا ہوگا......؟''

ہماری زبانوں سے ایک ساتھ نکلا۔ ہوسکتا ہے نا بھی نکلا ہو، محسوس یہی ہوا۔

انہوں نے اپنی بجھی بجھی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا، کچھ بولے نہیں۔

''جلدی کچھ کیجئے صفدر حسین مظہری...... یہ حالات تو ہمیں لے ڈوبیں گے......''

ہم نے گھگھیا کر ان سے فریاد کی۔ انہوں نے مایوسی سے سر جھکا لیا۔ صفدر حسین مظہری نے سر جھکا دیا تھا، یہ ہم پہلی بار دیکھ رہے تھے، ہم تو انہیں کے بھروسے نکل پڑے تھے۔ راستے میں جیسے بھی حالات آئے، انہوں نے ہمیں بخوبی نکال بھی لیا، اب جو ہم پر ایک ساتھ اتنی مصیبتیں نازل ہوئیں تو وہ سر جھکا رہے تھے۔

گاڑی رک گئی تھی۔ شاید اس کے بھی راستے مسدود ہو گئے تھے، پیچھے جانے کے راستے بھی بند تھے۔ زمین کا ہلنا، فضا کا گرجنا، آسمان کا دور ہونا کچھ تھم سا گیا تھا لیکن ہم جو گاڑی سمیت چاروں طرف سے گھیر لئے گئے تھے، اس کا کیا ہو......؟

کیا ہم گاڑی سے اتر پڑیں......؟

ہم نے اس کے امکانات پر غور کیا تو ہماری روحیں فنا ہو گئیں۔ گاڑی کے چاروں طرف مٹی کی دیواریں تھیں، گاڑی زمین میں دھنس گئی تھی، گاڑی اوپر آ سکتی تھی نہ ہم اس میں سے نکل سکتے تھے۔ صفدر حسین مظہری جس طرح خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے، اس سے ہمارے دل بیٹھے جا رہے تھے۔ وہی تو اپنی خوبصورت باتوں کے جال میں الجھا کر ہمیں یہاں لے آئے تھے، انہیں کچھ پتہ نہیں تھا تو پھر انہوں نے اتنی بڑی ہمت کیوں کر ڈالی......؟

ان کی سحر البیانی، آگے پیچھے کا سارا علم، حالات کا سامنا کرنے کی غیر معمولی قوت، ان کے اندر کا بے پناہ اعتماد...... کہاں گئے یہ سب......؟ اس وقت ضرورت تھی ہمیں اس مصیبت سے نکالنے کی، لیکن ہمارے سامنے تو ایک شکست خوردہ، ٹوٹا ہوا انسان بیٹھا تھا۔

وہ کس بل بوتے پر ہمیں یہاں لے آئے تھے......؟

شاید انہوں نے وہاں کے بارے میں صرف کچھ سن رکھا تھا اور اسے اپنی چرب زبانی کے ذریعہ ہمارے دماغوں میں بیٹھا دیا۔ بقیہ وہ کچھ نہیں جانتے تھے، بس سنی سنائی باتیں......

لیکن اب ان سب باتوں کے سوچنے کا فائدہ کیا تھا، کوئی زبردستی ہاتھ پیر باندھ کر تو انہوں نے ہمیں گاڑی میں نہیں لاد لیا تھا، ہم خود ہی ان کی باتوں سے سحر زدہ ہو گئے اور ایک نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے تھے۔

باتیں تو بہت تھیں لیکن سب بیکار...... اس وقت تو ضروری بس یہ تھا کہ اس قید سے نکلنے کی کوشش کی جاتی اور وہی ہم نہیں کر رہے تھے۔

پھر...... طوفان تھم گیا تھا، روشنی واپس آ گئی تھی۔

صفدر حسین مظہری کی طرف دیکھنا، ان کے بارے میں کچھ سوچنا، ان سے کچھ امید لگانا فضول تھا۔ ان کے لب پتھر ہو چکے تھے اور ان کا خوبصورت جسم سنگ خارا کے مجسمے میں تبدیل ہو چکا تھا۔

ہم نے پہلی بار اپنا جائزہ لیا۔

ہمارے سارے راستے بند تھے، مٹی کی دیواروں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا، ہم گاڑی کے اندر تھے، گاڑی نکلتی تو ہم نکلتے اور گاڑی کے نکلنے کی فی الحال کوئی صورت نہیں تھی، ابھی تو ہم گاڑی ہی میں محصور تھے۔

نجات کے لئے ابھی ہمیں بہت انتظار کرنا تھا۔ اور یہ انتظار ہی تھا جس کے ہاتھوں میں امید کی ایک موہوم سی قندیل تھمی ہوئی تھی۔

شکر ہے کہ ہمارے سروں پر ابھی تک روشن آسمان تھا اور مٹی کی دیواریں نم......

✠ • ✠ • ✠

سنگِ مرمر کا رنگ

وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی۔

لیکن لمبائی میں، میں اس سے کافی آگے نکل گیا تھا، اس کا سر میرے کاندھوں تک بہ مشکل پہنچتا تھا۔ میں اسے ہمیشہ چھیڑتا کہ دیکھو میں تم سے بڑا ہوں۔ وہ اپنی بڑائی کے اظہار میں میرا منہ چڑھا دیتی یا مجھے ایک دھپ لگا دیتی۔ کبھی کبھی وہ میرے گالوں پر نرم نرم، گیلا گیلا بوسہ ثبت کر دیتی جس سے میں مارے شرم کے سرخ اور دہرا ہو جاتا۔ اس پر ہنسی کا ایسا دورہ پڑتا کہ پھر آگے ہماری کوئی بات ہی نہ ہو پاتی۔

وہ میرے رشتے کی ایک پھوپھی کی بیٹی تھی۔ ہمارا روز روز کا ملنا ممکن نہیں تھا۔ اس کا مکان کافی دور تھا اور ہمیں ایک دوسرے کے ہاں تنہا جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ اس کی وجہ میں یاد نہیں بلکہ وہ حالات کہ چھوٹے بچوں کا تنہا نکلنا اس زمانے میں بھی خطرے سے خالی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اتفاق سے اماں اور پھوپھی میں ایسی قربت تھی کہ جب تک مہینے میں دو ایک بار دونوں مل نہیں لیتیں، انہیں چین نہیں پڑتا تھا۔ یا تو اماں ان کے ہاں چلی جاتیں یا پھوپھی ہمارے گھر آ جاتیں، دونوں کو ایک دوسرے کے لئے ہم سے زیادہ موزوں آدمی اور کہاں ملتا اس لئے دونوں صورتوں میں ہماری ملاقات یقینی تھی۔

ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کی جو تڑپ تھی اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس کے گھر میں نانی اور خالائیں ملا کر تین چار بزرگ خواتین تھیں، ان کے پاس کہانیوں کے ایسے پٹارے تھے جن میں گولر کے پھول رکھ دیئے گئے تھے، جتنا وہ خزانہ خرچ ہوتا اتنا ہی لبالب بھرتا جاتا۔ میرے گھر

میں تو اس زمرے میں صرف میری دادی آتیں لیکن ان کا خزانہ بھی کم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ ان بزرگوں کی کہانیاں چاہے جیسی بھی ہوں، ان میں ایک شہزادی ضرور ہوتی، کبھی راجہ کی بیٹی، کبھی بہن، کبھی بہت ظالم، کبھی مظلوم...... اکثر کو دیو اٹھا لے جاتا۔ پھر کوئی بہادر شہزادہ بہت جتنوں سے اسے بچا کے لے آتا۔ ایک بات عام طور پر مشترک یہ ہوتی کہ لاکھ مصیبتوں کی آندھیاں آئیں، ہزار طوفان اٹھیں، آگ کے کتنے دریا سامنے آجائیں، فتح ہمیشہ شہزادی ہی کی ہوتی، شہزادہ تو اس کے ساتھ فتح میں بس شریک ہو جاتا۔

ہمارے اندر کہانیوں کا اچھا خاصا اسٹاک جمع ہو جاتا تو ہم ایک دوسرے سے ملنے کو بیتاب ہو جاتے۔ وہ تو اپنی ماں سے صرف ضد ہی کرتی ہوگی، میں تو رکشہ بلا کر اس پر چادر تک تنوا دیتا، تب اماں کو خبر کرتا۔ اماں ناراض ہوتیں، پھوپھی سے ملنے کی خواہش تو ان کی ہوتی لیکن گرہستی کے جھنجھٹ سے وہ بے موقع یا آسانی سے وقت نہیں نکال پاتی تھیں لیکن رکشہ آجاتا تو بک جھک کر انھیں جانا ہی پڑتا۔ رکشہ والا تو اتنی دور آنے کے پیسے وصول ہی کر لیتا پھر کیوں نہ جا کر ہی پیسے حلال کیے جائیں۔ اس طرح اماں کے بہت پیسے حلال ہو رہے تھے۔

ہمارے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ ہم فوراً اپنے اسٹاک کو نہیں نکالتے تو پھر نئے اسٹاک کی گنجائش کہاں ہوتی۔ دوسرے ہماری کہانیوں کی شکلیں آپس میں اس قدر ملتی تھیں کہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جانے اور اپنی اصلیت کے کھو جانے کا ہر وقت خطرہ موجود ہوتا۔ اس لئے ملنا ضروری تھا کہ ہر نئی اور تازہ کہانیاں اپنے قدم جما سکیں اور ان کی شکلیں بھی مسخ نہ ہوں۔

ایک اور بڑی وجہ تھی جو اب سمجھ میں آتی ہے کہ اس شیریں لب سے کہانیاں سننے کا بھی ایک نشہ تھا۔ ایمان داری کی بات یہ ہے کہ کہانی کے رموز و نکات اور واقعات و محلات پر کس کم بخت کا دھیان ہوتا وہ تو موتیوں جیسے الفاظ کے زیر و بم اور اس کے ساتھ نشر ہونے والی موسیقی پر مرکوز ہوتا۔ جیسے کوئی آبشار دھیرے دھیرے بہہ رہا ہو۔ کبھی چلّو میں بھر کر اس آبشار کے پانی کو چکھا جائے تو وہ پانی نہیں بہت میٹھا شربت ثابت ہو، لیکن ان باتوں کا گیان اس وقت ہرگز نہیں تھا۔ اس وقت تو بس یہ تھا کہ ہم ملتے ہی کسی کونے میں جا بیٹھتے اور پھر اپنی اپنی پٹاریوں کو کھول ڈالتے۔ ایسی بے صبری ہوتی کہ کبھی آدھی کہانی ایک کہا تو آدھی دوسری، حالانکہ دونوں الگ الگ کہانیاں ہوتیں۔ ہمارے درمیان بیک وقت کئی کئی کہانیاں چلتیں اور کبھی کہانیوں کی پٹریاں

علیحدہ، یہ نہیں کہ ایک کہانی دوسری کہانی کی پٹری پر چڑھ گئی، دوسری تیسری کی پٹری پر۔ ایسا اس لئے بھی ممکن نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے کی کہانیوں کی نکیل اپنے ہاتھوں میں تھامے رہتے، دوسرا جب بھی بھٹکنے لگتا تو یہ نکیل اس کے ہاتھوں میں تھما دی جاتی۔ مثلاً اس کی کہانی میں آدھے قصے تک شہزادی جنگل میں بھٹک رہی ہوتی...... درمیان میں، میری کہانی شروع ہو جاتی جس میں شہزادی دریا میں غوطے کھا رہی ہوتی۔ یہاں تک کہ...... اب باری اس کی آجاتی، وہ بے خیالی میں اپنی شہزادی کو دیو کے پنجرے میں پہنچا دیتی، میں فوراً ٹوک دیتا۔ ابھی تو شہزادی جنگل میں بھٹک رہی ہے......۔

کہانی بیان کرتے وقت اس کی آنکھوں کا اتار چڑھاؤ ہاتھوں کی نقل و حرکت، آواز کا نشیب و فراز، خوشی، غم، خوف...... کے اظہار کے طریقے ایسے تھے جو کہانی سننے والے کو بلکہ دیکھنے والے کو مسحور کر دیتے۔ آگے چل کر جب یہ سحر مجھ سے چھن گیا تب مجھے احساس ہوا کہ دراصل میں کس قدر نشہ آور ہو چکا تھا۔ یہ کیفیت چھن جانے کے بعد میں کس قدر کھوکھلا اور ٹنڈ منڈ ہو گیا، لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے، ابھی تو درمیان میں بہت کچھ ہے۔

اس کے رشتے کی ایک بھابی اس کے گھر میں رہتی تھی جس کا میاں کلکتہ میں بوٹ میں کام کرتا تھا، سال کے سال آتا، ایک ماہ گھر پر رہ کر جو خوشیاں سمیٹ سکتا تھا، دونوں ہاتھوں سے خوب سمیٹتا اور گیارہ مہینوں کی جدائی اور آنسوؤں کے تحفے دے کر چلا جاتا۔ پھوپھی کے گھر میں اس بھابھی کے دم سے ایک رونق سی تھی۔ وہ گھر کے سارے کام کر لیتی، اس کی وجہ سے پھوپھی کو کسی مددگار یا نوکرانی کی ضرورت ہی نہیں تھی، لیکن تھی وہ ایک نمبر کی چنچل اور شوخ۔ عجیب عجیب مذاق کرتی اور بہت ہی عجیب بلکہ نہ سمجھنے والے انداز میں ہنستی، صاف لگتا کہ وہ جس بات پر ہنس رہی ہے، دراصل وہ بات ہے نہیں، اس کے پیچھے کچھ اور ہے۔ لیکن یہ پیچھے ہماری دسترس سے ہمیشہ دور رہا۔ آج اس کی ہنسی یاد آتی ہے تو کچھ کچھ سمجھ میں ضرور آتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ اسے اپنی زبان میں دہرا دوں، یعنی آج بھی اس کی ہنسی کا ابرار باقی ہے۔ ہم اس سے بہت خائف رہتے کیونکہ وہ ہمیں بہت آسانی سے اپنا نشانہ بنا لیتی۔ آفریں تو اس کی نند ہی ٹھہری، میں ٹھہرا نند کا بھائی۔ اس لئے اسے قانونی اور سماجی طور پر ہم پر نشانہ سادھنے کی پوری چھوٹ بھی تھی۔ اس چھوٹ کا وہ خوب فائدہ بھی اٹھاتی۔ ہمیں دیکھ کر وہ کون کون سے جملے کستی اور کیا کیا اشارے

کرتی، وہ سب تو ہماری سمجھ میں نہ آتے لیکن وہ ہنستی بہت تھی۔

''کیا کر رہے ہو تم لوگ ساتھ بیٹھے......؟''

مجھ سے تو کوئی جواب ہی نہیں بنتا البتہ آفریں تڑ سے جواب دیتی۔

''کیا کریں گے......؟ کہانی سن رہے ہیں اور کیا......؟''

اس پر بھابھی اپنی آنکھیں نکالتی۔

''کہانی سنی جا رہی ہے......؟ ابھی اماں سے کہوں کہ یہ لوگ......''۔

''ہاں کیا......؟ کیا کر رہے ہیں ہم لوگ......؟''

آفریں بھی تن تنا کے کھڑی ہو جاتی، اس کے چہرے پر غصے کے واقعی رنگ ابھر آتے۔ بھابھی کے چہرے پر تو مصنوعیت کا غازہ ہوتا وہ بھی مسکراہٹوں میں لپٹا ہوا۔

''سچ بات بہت زہر لگ رہی ہے نا......؟ تنہائی میں سب کی نگاہوں سے دُور بیٹھے ہو......ابھی جا کر سب کو بتادوں......؟''

بھابھی کیا کہہ رہی تھی......؟

میں تو خیر، بہت چھوٹا تھا، دس گیارہ سال عمر ہوگی، اس کی عمر البتہ کچھ زیادہ تھی، بھابھی کی بات میری سمجھ میں تو نہیں آئی لیکن آفریں کا چہرہ سرخ ہو گیا، میں تو سمجھا کہ شاید غصہ میں ایسا ہو گیا ہے لیکن نہیں......وہ کوئی اور رنگ تھا......غصہ ہوتی تو فوراً کھڑی ہو جاتی، اس کی یہی عادت تھی، لیکن وہ تو اپنی جگہ پر بیٹھی تھی، مجھے دیکھ رہی تھی کبھی بھابھی کو۔ اس کی اس کیفیت سے بھابھی نے خوب لطف اٹھایا اور خوب کھلکھلا کر ہنسی۔

ہنس ہنسا کر وہ تو چلی گئی، ہماری کہانیوں کا گلا بھی گھونٹ گئی۔ ہم کیا کہہ رہے تھے، کیا سن رہے تھے، سب بھلا چکے تھے۔ کتنی دیر تک ہم یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے، یہاں تک کہ اماں نے مجھے آواز دی۔

''چلنا نہیں ہے کیا......؟ رکشہ نہیں لاؤ گے......؟''

میں چلنے کے لئے کھڑا ہوا تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''اب کیا ہوگا......؟''

اچانک جیسے اسے ہوش آ گیا۔ سرخی مائل رنگ اب زائل ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ جس رنگ

نے لی تھی، میں اس سے واقف نہیں تھا، وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''پاگل ہے بھابھی، تم کچھ خیال مت کرنا......''۔

''تو......؟''

میں نہ جانے کیوں پوچھنا چاہ رہا تھا۔

''جو کہانیاں آج راستہ بھول گئیں، وہ پھر اپنا راستہ پکڑیں گی......''۔

اس کے لہجے میں پتہ نہیں کون سا جادو تھا کہ میں واقعی سب کچھ بھول گیا اور بہت مطمئن، بہت ہنسی خوشی گھر لوٹا۔

بھابھی کی اس دن کی بھیدوں بھری ہنسی اور بے مطلب باتوں نے میرے اندر ایک نامعلوم قسم کا تجسّس پیدا کر دیا جس کا بنیادی نقطہ آفریں تھی۔ میں جلد سے جلد اس سے پھر ملنے کی آرزو میں دن گننے لگا۔

اس دفعہ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ گھر میں مہمانوں کی آمد کا جو سلسلہ شروع ہوا تو ہفتوں کھنچ گیا۔ اماں انہیں چھوڑ کر نکل ہی نہیں سکتی تھیں اور مجھے وہاں اکیلے جانے میں ایک جھجک سی تھی۔ حالانکہ چلا جاتا تو کوئی پہاڑ نہیں ٹوٹ پڑتا۔ اصل میں شروع سے نہیں گیا تو اب جانے میں عجیب سا لگتا تھا۔ ویسے ہمت کریں تو بہت سی ان دیکھی دیواریں اپنے آپ ڈھہہ جاتیں، پھوپھی بھی دیکھ کر خوش ہی ہوتیں، ہمیں بار بار ملنے کا موقع ملتا۔ یہ سلسلہ شروع ہو جاتا تو پھر چلتا ہی رہتا۔ اماں کو بھی خواہ مخواہ کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی اور میرا بھی وقت بچتا جو اماں کو پھوپھی کے ہاں لے جانے کے نت نئے بہانے ڈھونڈھنے میں صرف ہوتا تھا۔ اس بار اماں کا نہیں جانا بہت طول کھنچ گیا تو میں بہت سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ پھوپھی کے ہاں جانے میں مجھے اماں کی محتاجی کیوں ہے......؟ وہ میری رشتہ دار ہیں اور فرصت کے اوقات میں ان کے ہاں جا سکتا ہوں۔ کسی نے آج تک مجھے وہاں جانے کو نہیں کہا تو منع بھی نہیں کیا، چلا ہی جاؤں تو کوئی مجھے منع تھوڑی کرے گا۔

کیوں نہ ایک بار ہمت کر ہی لوں......؟

ایک ہی بار......

بس ایک بار جھجک کی دیوار اٹھ جائے تو پاؤں کی ان دیکھی زنجیر خود بہ خود ٹوٹ جائے گی۔

میں نے ارادہ کرلیا کہ آئندہ چھٹی کے دن وہاں ضرور جاؤں گا، ابھی اماں سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، وقت آئے گا تو کہہ دوں گا، یوں اماں مجھے منع کیوں کرنے لگیں......؟

اب اسے اتفاق ہی کہا جائے کہ ایک دن پھوپھی خود ہی تشریف لے آئیں، آفریں بھی ان کے ساتھ تھی۔ مجھ پر حیرت اور خوشی کا ایسا دورہ پڑا کہ میں اپنی سدھ بدھ کھو کے ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگا۔ مجھے بھی اس طرح مبہوت دیکھ کر اس نے میری ناک اور کان پر اپنے مرمریں ہاتھ رکھے، میرے چہرے پر پھونک ماری اور میری آنکھوں کے سامنے اپنی انگلیاں نچانے لگی۔ میں واقعی ہوش میں آگیا۔

''میں تو سمجھی، تم گئے......''۔

وہ آنکھیں مٹکا کر شوخ لہجے میں بولی۔ میں خجل سا ہوگیا، ایسا نہیں تھا کہ وہ آتی نہیں تھی، کم آتی تھی جب کہ اماں...... لیکن اماں خود کہاں جاتی تھیں، وہ تو میں انہیں زبردستی لے جاتا تھا۔

''اس دفعہ میں نے سوچا تھا کہ اکیلا ہی آجاؤں......''۔

میں نے اپنی بدحواسی کو ایک ہی جملے میں سمیٹنے کی کوشش کی، اس نے بڑی شوخی سے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

''اچھا......؟ بہت نیک ارادہ ہے، پھر اس پر عمل کیوں نہیں ہوا......؟''

''اب تو تم آہی گئیں......''۔

میں نے بھی یونہی کہہ دیا۔

''اور بھابھی......؟ اُن کا خیال نہیں آیا......؟''

اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

''کیا ہوا بھابھی کو......؟''

مجھے واقعی کوئی خیال نہیں تھا۔

''اکیلے آتے نا تو کچا چبا جاتی تمہیں......''۔

بولتے بولتے وہ ہنس پڑی۔

''کیوں بھائی......؟''

میں نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"آ کر خود ہی دیکھ لینا......"۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہنا کیا چاہ رہی تھی۔ میں نے ذہن پر تھوڑا زور ڈالا تو بھابھی کی اوٹ پٹانگ باتیں، سمجھ میں نہ آنے والی ہنسی، آنکھیں مٹکانا، آنکھیں دکھانا...... یاد آیا۔ لیکن میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا اور آئندہ اس کے ہاں تنہا جانے کے اپنے ارادے پر اٹل رہا۔ اس روز ہم کہانیوں کا آدان پردان بھی نہیں کر سکے، مہمانوں کی بھیڑ تو تھی ہی، کچھ ہم سن لڑکے لڑکیاں بھی تھے جنھیں ہم ایک نعمت کے طور پر ہاتھ آ گئے تھے۔ وہ ہمیں ایک لمحہ کے لئے بھی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اس کے آجانے کی جو خوشی ہوئی تھی، وہ ادھوری رہ گئی، ہماری کہانیاں ہمارے دل میں ہی رہ گئیں۔

اس کے جانے کے بعد دیر تک اس کا چہرہ نگاہوں میں تیرتا رہا اور اس کی باتیں...... جملوں کی ادائیگی، لوچ، شیرینی، ہونٹوں کے زیروبم، آنکھوں کی چمک، بے ساختہ ہنسی، مسکراتا ہوا چہرہ......

میرا جی چاہتا کہ وہ بے تکان بولتی رہے، کچھ بھی، کوئی بات بھی......ایسی کہ جس کا کوئی سر پیر نہ ہو، کوئی مطلب نہ ہو، ہمیں کوئی مطلب درکار ہی نہیں تھا۔

لیکن بھابھی......؟

بھابھی کی سمجھ میں نہ آنے والی عجیب وغریب حرکتیں میں دیکھ چکا تھا، اب اس نے بطور خاص ذکر کیا تو میرے دل کے اندر بھی ایک بڑا سوالیہ نشان کمر پر ہاتھ دھرے آ کھڑا ہوا۔

بھابھی کیا کہنا چاہ رہی تھی......؟

اس سوال کا جواب تو اس کے پاس بھی نہیں تھا، میرے پاس کہاں سے آتا، لیکن اس کا جواب ضروری بھی تھا۔

اب تو میرا اس کے ہاں جانا اور ضروری ہو گیا، وہ بھی تنہا۔

چنانچہ تین چار روز کے بعد ہی میں وہاں پہنچ گیا، پھوپھی مجھے دیکھ کر خوش تو بہت ہوئیں لیکن وہ پوچھ بیٹھیں۔

"بھابھی سے پوچھ کر آئے ہو......؟"

اس کا تو میرے پاس جواب ہی نہیں تھا۔ میں واقعی اماں سے پوچھ کر نہیں آیا تھا۔ انہوں

نے پوچھا تو مجھے یاد آیا، یہ بھی یاد آیا کہ میں ایک خاص قسم کی کیفیت میں جسے شاید جادو کہتے ہیں، مبتلا تھا اور اس کے زیر اثر یہاں تک آ پہنچا تھا۔

میں نے سر جھکا دیا، پھوپھی چپ ہو گئیں، پھر دھیرے سے بولیں۔

''نہیں بیٹا، آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہئے، میں تم کو آنے سے منع نہیں کرتی لیکن بھابھی کی اجازت کے بغیر نہیں......''۔

میں نے بے بسی سے آفریں کی طرف دیکھا، وہ چپ چاپ بے سمت کہیں تکتی رہی۔ میرا جی چاہا کہ تیزی سے بھاگ جاؤں اور کسی کونے میں منہ چھپا کر خوب روؤں، خوب روؤں...... شاید میں بھاگ بھی لیتا کہ آخر پھوپھی ہی نے مجھے سنبھالا اور بڑے لاڈ سے آفریں سے مخاطب ہوئیں۔

''میرا بیٹا آ ہی گیا ہے تو اسے اندر لے جاؤ، کل میں نے جو حلوہ بنایا تھا اور کھیر، وہ نکالو......''۔

وہ جیسے اشارے کی منتظر تھی، ایک جھٹکے سے اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اندر کھینچنے لگی۔

میرے اندر ایک دم سے جو غبار بھر آیا تھا، وہ وقتی طور پر باہر نکلنے سے ختم ہو گیا اور ہم اپنی کہانیوں میں گم ہو گئے۔ لیکن میری پریشانیاں ختم کہاں ہوئیں، پھوپھی کے سامانوں میں سے پتہ نہیں کیا چیز اچانک گھٹ گئی اور آفریں کا فوراً بازار جانا ضروری ہو گیا، وہ جانے لگی تو میں بھی ساتھ جانے کو اٹھ کھڑا ہوا، لیکن پھوپھی نے منع کر دیا۔

''ابھی تو آئے ہو، خواہ مخواہ پریشان ہونے سے فائدہ......؟''

پھوپھی تو اپنے کام میں مصروف ہو گئیں اور مجھے فوراً بھابھی نے آ لیا۔ اُس نے سر سے پیر تک مجھے یوں بغور دیکھا جیسے میں اپنے اندر کچھ چھپائے ہوئے ہوں، تاڑنے والی ایسی نگاہیں جن سے پورے جسم میں چھید ہو رہے تھے، پھر اُس نے اپنی مسکراہٹوں کے مختلف زاویوں سے میری پڑتال شروع کی، ایسا لگ رہا تھا کہ میں کوئی فراری مجرم ہوں اور اچانک پولس کے ہاتھ لگ گیا ہوں۔ میرے پورے جسم میں سنسنی پھیل گئی، زبان گنگ ہو گئی، یوں بھی میں ان سے کہاں مخاطب ہوتا تھا، اُس کو تو دیکھ کر ایک عجیب گھبراہٹ سی طاری ہونے لگتی تھی، اس وقت وہ کیفیت کئی گنا بڑھ گئی۔ پتہ نہیں اب کیا ہونے والا ہے، آفریں کو بھی اسی وقت بازار جانا تھا، کم سے کم

بھابی کے حملوں سے تو وہ مجھے بچا ہی لیتی تھی۔

''بڑے ہمت والے ہو تم تو بھائی......؟ ایک دم اکیلے چلے آئے......''۔

میں بے بسی سے اُسے دیکھتا رہا۔

''بہت تڑپ تھی نا آفریں سے ملنے کی......؟''

اب کی وہ کسی قدر سنجیدگی سے بولی۔ اس سے میرے وہ حواس جو سب کے سب گم ہو گئے، کچھ واپس آتے محسوس ہوئے، زبان پر پھر بھی تالہ پڑا رہا۔

''شادی کرو گے اس سے......؟''

اچانک اُس نے پوچھ دیا، میں بوکھلا گیا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''شادی......؟''

''ہاں جی شادی......اتنی تڑپ تو اس کے لئے ہوتی ہے نا جس سے آدمی شادی کرنا چاہتا ہے......''۔

وہ مسکرا تو اب بھی رہی تھی لیکن اس مسکراہٹ سے اب زہر کی وہ شعاعیں نہیں نکل رہی تھیں جو سیدھے جسم کے اندر گھپ جائیں، اس نے وہ سوال کیا تھا جس کا دور دور تک میرے ذہن میں جواب نہیں تھا۔

شادی......!!

شادی تو میں نے بہتوں کی ہوتے دیکھی تھی، اس میں سب کی نگاہوں کا اصل مرکز دولہا ہوتا ہے، اچھے اچھے کپڑے پہنتا ہے، جس جانب قدم اٹھاتا ہے، سب کے قدم اسی جانب اٹھتے ہیں، جس طرف دیکھتا ہے، سب اسی طرف دیکھنے لگتے ہیں، کس کا جی نہیں چاہے گا دولہا بننے کو......؟

لیکن دولہا بننے کے لئے ہی تو شادی کرنی پڑتی ہے۔

شادی......!!

شادی تو سب سے پہلے میں نے سوچا تھا کہ اماں سے کروں گا، ان سے اچھی ذات دنیا میں اور کون تھی، ایک دن ابا کے غصے میں اماں نے مجھے بہت مارا اور باجی نے ان سے چھڑا کر اپنی گود میں بالکل چھپا لیا تھا، اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ شادی اماں سے نہیں باجی سے کروں گا،

اماں سے تو ہرگز نہیں، بعد میں معلوم ہوا کہ اماں، یا باجی وغیرہ سے شادی ہو ہی نہیں سکتی، یہ بہت گناہ کا کام ہے۔ اتنی قریب رشتہ دار سے شادی نہیں ہو سکتی، ویسے بھی دونوں کی شادیاں ہو چکی تھیں، اب بھابھی کیا پوچھ رہی ہے......؟

تو کیا آفریں سے میری شادی ہو سکتی ہے......؟

وہ بھی تو میری رشتہ دار ہے، پھوپھی کی بیٹی...... ہاں کہہ دوں، پھر معلوم ہو کہ...... آفریں سے میری شادی ہو سکتی ہے کیا......؟

میں نے نگاہیں نیچی کئے ہوئے بھابھی سے پوچھا، مجھے آج تک اپنے آپ پر تعجب ہے، وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، وہ ہنستی بہت تھی۔

''تم چاہو تو میں کرا سکتی ہوں......''۔

''لیکن وہ تو...... وہ تو پھوپھی کی بیٹی ہے نا......؟''

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، وہ پھر ہنسی۔

''پھوپھی کی ہے نا...... یہ تو اور اچھا ہے......''۔

میری آنکھوں میں پہلی بار بھابھی کے لئے پسندیدگی اُمڈ آئی۔ اُسی وقت آفریں سودا سلف لے کر واپس آ گئی۔ بھابھی اسے دیکھ کر اور ہنسنے لگی، وہ بھونچکا سی ہمیں دیکھنے لگی، کبھی مجھے، کبھی بھابھی کو، کبھی ہم دونوں کو ایک ساتھ۔

''میں نے بات کر لی ہے اس سے......''۔

بھابھی نے اسے بہت شوخ لہجے میں بتایا۔

''کون سی بات......؟''

اس نے بہت معصومیت سے پوچھا۔

''اسی سے پوچھ لینا......''۔

بھابھی کہہ کر چلی گئی، پھوپھی نے اسے پکار لیا تھا۔

آفریں نے فوراً مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ اس نے اپنی مٹھی میں چھپی دو کھٹی میٹھی گولیاں میری مٹھی میں منتقل کر دیں، جو اس کی مٹھی میں پسیج گئی تھیں۔ اب وہ میری مٹھی میں پسیجنے لگیں۔ اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''کیا کہہ رہی تھی......؟''

''کہہ رہی تھی میں تم سے شادی کرلوں......''۔

میں نے بے دھڑک بتا دیا۔ وہ ہڑ بڑا کر کھڑی ہوگئی، میں بھی گھبرا کے کھڑا ہوگیا۔ شاید مجھے اتنی سادگی سے یہ بات نہیں بتانا چاہئے تھی، اس بات میں یقیناً کچھ پیچ تھے اور مجھے آہستہ آہستہ انہیں کھولنا چاہئے تھا۔ میں ڈری ڈری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ بیٹھ گئی۔ میں بھی بیٹھ گیا۔

''بھابھی پاگل ہے، وہ یوں ہی بکتی رہتی ہے، تم اس کی باتوں پر دھیان نہ دینا......''۔

اس کے الفاظ بہت آہستہ آہستہ میرے کانوں میں اُترے......شاید کانوں کے ذریعہ دل میں اُترے۔

''بالکل دھیان نہ دوں......؟''

میں نے پتہ نہیں اپنے آپ کو کس جال میں پھنسا محسوس کیا یہ بے پناہ خواہش بھی کہ اس جال سے کوئی مجھے ہرگز نہ نکالے......کبھی نہیں۔

''دھیان دینے کی بات ہی نہیں، اس کے کہنے سے تھوڑی ہو جائے گی شادی؟ وہ تو جب اماں، ابا، ماموں، ممانی چاہیں گے، پھر ہم تم......''۔

وہ خاموش ہوگئی، اس کے لہجے میں اچانک ایک تبدیلی سی آ گئی تھی جو مجھے صاف محسوس ہوئی۔ لیکن اس کی بات تو ادھوری تھی، اس وقت مجھے ادھوری بات کو سمجھنے کی بالکل سمجھ نہیں تھی، آج بھی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ ہمارے ابا، اماں کے چاہے بغیر ہماری شادی کیسے ہوسکتی ہے، لیکن وہ آگے کیا کہنا چاہ رہی تھی......؟

میں نے بھی اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ اور چپ چاپ واپس چلا آیا۔

اماں میری اتنی دیر کی غیر موجودگی سے پریشان تو تھیں ہی، لٹکا ہوا میرا منہ دیکھ کر اور پریشان ہوگئیں۔

''کہاں گئے تھے......؟''

''پھوپھی کے ہاں......''۔

میں نے مختصر جواب دیا، وہ حیرانی سے میرا منہ تکنے لگیں۔

''پھوپھی کے ہاں......؟ مجھے خبر کئے بغیر، مجھ سے پوچھے بغیر......؟''

''موقع نہیں ملا، اسکول سے چلا گیا تھا نا......''۔

میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی، انہوں نے میرے دبلے پتلے چھوٹے سے قد کو یوں دیکھا جیسے کسی جوان رعنا کو پرکھا جاتا ہے، وہ طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

''تو گویا جناب اتنے بڑے ہو گئے کہ مجھ سے پوچھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی اور جو ابا کو یہ بات معلوم ہو گئی تو......؟''

اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ وہاں جانے کو میں جتنا آسان سمجھ رہا تھا، وہ اتنا آسان تھا نہیں، میں نے تو اسے ہلکے پن سے لیا تھا لیکن یہاں تو سوالوں کی ایک باڑھ کھڑی ہو گئی، زیادہ کچھ بحث کرنے سے بہتر یہی تھا کہ چپ چاپ اپنی غلطی تسلیم کرلوں، کہیں آئندہ کے لئے جانا بند ہی نہ ہو جائے۔

اس رات میرا ذہن نامعلوم پریشانیوں کا ایسا آماجگاہ بنا کہ اس کا سارا زور میرے کم سن بدن پر آ گرا۔ مجھے اتنا تیز بخار آ گیا کہ میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا، پتہ نہیں کب تک...... جب میں نے آنکھیں کھولیں تو اماں، ابا اور باجی کو اپنے اُوپر جھکا ہوا پایا۔ سب کے چہرے ستے ہوئے تھے اور ان پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، میرا جی چاہا کہ پوچھوں...... میں کہاں ہوں......؟

لیکن یہ بات مناسب نہیں لگی۔ ظاہر ہے میں اپنے گھر میں تھا تب ہی تو میرے ماں، باپ، بہن میرے اردگرد موجود تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر سب کے چہرے کھل اٹھے، اماں لپک کر گلاس میں پانی لے آئیں اور میرے منہ سے لگا دیا۔

''پتہ ہے، جناب کتنے دن بے سدھ رہے......؟''

باجی نے میری پیشانی پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی شفقت سے پوچھا، میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ ہولے سے بولیں۔

''پورے ڈھائی دن......!''

ڈھائی دن......؟؟ یعنی پورے دو دن اور نصف...... اتنے دن میں کہاں کھویا رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ایک لمبے سفر سے واپس آیا ہوں۔ ایک بھید بھرے جہاں سے...... میری آنکھوں نے کیا کیا نہیں دکھایا مجھے۔

اس محل میں پتہ نہیں کتنے دروازے تھے، ہر دروازے کی پیشانی پر ایک ایک روزن......
ہر دروازے سے بھابھی جھانکتی تھی اپنے قہقہوں کے ساتھ......اس کے قہقہوں کے بھی عجب رنگ تھے، ہر بار محسوس ہوتا کہ وہ ایک نیا قہقہہ لگا رہی ہے۔ جب بھی کسی دروازے پر اس کا چہرہ دکھائی دیتا، اسی وقت اس کے اوپر والے روزن سے آفریں کا ستا ہوا، مایوس چہرہ بھی نظر آتا۔ میرا ذہن ان دونوں چہروں کے رمز سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر تھا۔ میں چیخ کر بھاگنے کی کوشش کرتا لیکن بھاگ کر کہاں جاتا، ہر چہار طرف کے دروازوں پر تو بھابھی تھی......میں روزن میں آفریں تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن اس کے لئے دروازوں کو پھلانگنا پڑتا......

''پتہ ہے بے ہوشی کے عالم میں تم کیا بکتے رہے......؟''

باجی نے دریافت کیا، اگرچہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن میں ڈر گیا کہیں وہ سب باتیں میری زبان پر نہ آگئی ہوں......میں نے خوف زدہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

''بچاؤ، بچاؤ، بھاگو، بھاگو......''۔

انہوں نے بڑی آسانی سے بتایا، میری جان میں جان آئی۔

''آخر تم کس سے ڈر رہے تھے......؟''

اس دفعہ باجی کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

''کسی سے بھی نہیں......''۔

میں نے جواب دینے میں جلدی کی۔

''اے لڑکی، تنگ مت کرو میرے بچے کو، ڈراؤنا خواب دیکھا ہوگا، بیماری میں ہوتا ہے......''۔

اماں نے باجی کو آگے کچھ کہنے سے روک دیا اور میں آنکھیں بند کر کے اماں کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ کیا یہ سچ مچ خواب ہی تھا......؟

مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک عجیب سچویشن میں پھنس گیا ہوں، اس میں ساری باتیں بے معنی ہیں، کسی چیز کا کوئی مطلب نہیں نکلتا، نکلتا بھی ہے تو بس تھوڑی دیر اور تھوڑی دور تک کے لئے۔ لیکن یہ سچویشن کس کا پیدا کردہ ہے......؟

سراسر میرا......

جو چیز جل رہی تھی، میں اسے یونہی جلنے دیتا تو اس مصیبت میں کیوں پڑتا۔ خواہ مخواہ میں نے اپنی بے وقوفی سے ایسا سچویشن پیدا کیا کہ اس میں خود پھنس گیا۔

کئی روز کے بعد بستر سے اٹھا تو کافی کمزور ہو چکا تھا۔ کہیں جانا تو دور کی بات، اسکول تک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس درمیان پھوپھی بھی نہیں آئیں، انہیں میری بیماری کی خبر ہی نہیں ملی ہو گی۔

ہفتوں کے بعد اچانک اماں نے خود وہاں جانے کا پروگرام بنایا، پہلے تو میں ہی دوڑ دوڑ کر رکشہ لاتا تھا، اس دفعہ اجازت نہیں ملی، البتہ اماں کے ساتھ تو مجھے جانا ہی تھا۔

اس کی آنکھوں میں شکایت کی نمی تھی، ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ۔

''میں سمجھی تم راستہ بھول گئے......''۔

''میں کتنا بیمار تھا، تم نے خبر ہی نہیں لی......''۔

مجھے بھی تو شکایت کرنے کا حق تھا۔

''بیمار......؟ یہاں تو کوئی خبر ہی نہیں...... اچھا اسی لئے اتنے دبلے پتلے اور کمزور دکھ رہے ہو......''۔

یکلخت ساری شکایتیں ختم ہو گئیں۔ اب نہ اس کی شکایت باقی رہی نہ میری۔ ہم اس کے مکان کے پچھلے دالان میں اپنی مخصوص جگہ پر جا بیٹھے۔

ابھی بہت کہانیاں باقی تھیں۔

اچانک بھابھی کی آہٹ سنائی دی، وہ جھٹ سے مجھ سے کچھ دُور جا بیٹھی، مجھے یہ بات کچھ عجیب لگی۔ بھابھی نے حسب معمول نامعلوم بھیدوں سے بھری نگاہ اور مسکراہٹ ہم پر ڈالی اور چلی گئی، اس نے کچھ کہا نہیں، یہ بات تعجب خیز تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی وہ میرے قریب نہیں آئی تو میں ہی اٹھ کر اس کے پاس جانے لگا۔ اچانک وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''دور ہی رہو......''۔

''کیوں......؟''

اچانک میرے منہ سے نکلا، مجھے ایک دھکا سا لگا۔

''بس یونہی......''۔

اس نے نگاہیں نیچی کرلیں اور آہستہ سے بولی۔

''نہیں، آخر کیوں......؟''

میں بھی بضد ہوگیا، مجھے اپنی سبکی کا احساس ہوا تھا۔

''گناہ ہوتا ہے......''۔

اس کا لہجہ بالکل اجنبی تھا اور بہت دُور سے آتا ہوا لگا، کم سے کم میں تو ہرگز اس سے مانوس نہیں تھا۔

''گناہ......!؟''

اس نے یہ کیا کہہ دیا......؟ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ساتھ ساتھ بیٹھنا گناہ کیسے ہوگیا۔ اتنی بڑی بات اس کے منہ سے نکلی کیسے۔ لیکن میں اس سے بحث بھی نہیں کرسکتا تھا۔ دراصل اس سلسلے میں، میں کچھ جانتا ہی نہیں تھا تو بحث کیا کرتا، چپ ہوگیا۔ جو کہانیاں...... مکمل اور نامکمل میں اس کے لئے لے گیا تھا، وہ سب ساتھ بھلا گئیں یا آپس میں یوں گڈمڈ ہوگئیں کہ ان کی پہچان ناممکن ہوگئی۔ خیر، مجھ پر تو اچانک ہتھوڑا پڑ گیا تھا، اس کو کیا ہوا تھا، اسے بھی تو اپنی کوئی کہانی یاد نہیں آئی۔ ہم یوں باتیں کررہے تھے کہ اب نہ میرا جی لگ رہا تھا نہ اس کا، اسی ادھیڑبن میں اماں واپسی کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

میرے ذہن کے تار الجھتے گئے۔

ساتھ بیٹھنے سے گناہ کیسے ہوا......؟

وہ کہنا کیا چاہ رہی تھی......؟

وہ تو ایسی کبھی نہ تھی۔

بھابھی عجیب عجیب باتیں ضرور کرتی لیکن گناہ ثواب کی بات کبھی نہیں کرتی تھی۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی تھی۔

میرا کسی کام میں جی نہیں لگنے لگا، جی لگانے کی کوشش کرتا تو ذہن طرح طرح کی بے معنی باتوں میں اُلجھ جاتا۔ کتابیں کھولتا تو اس کے ہر صفحے پر آفریں کا چہرہ دکھائی دیتا، کبھی ہنستا ہوا، کبھی مسکراتا ہوا، کبھی اپنی کہانیاں کہتا ہوا، کبھی میری کہانیاں سنتا ہوا، کبھی میری کہانی کو درمیان ہی میں روک کر اپنی کہانی کہتا ہوا، کبھی بھابھی کی بات پر تمتمایا ہوا، کبھی بھابھی کے حملوں

سے اس کی دفاع کرتا ہوا......ان تمام چیزوں کے ساتھ ایک چہرہ اور جڑ جاتا......ہونٹوں پر انگلی رکھ کر منع کرتا ہوا......"۔

"یہ گناہ ہے......!!"

"گناہ......؟؟"

میں کتابیں بند کر دیتا اور آنکھیں موند کر اوندھے منہ لیٹ جاتا، راہ نجات پھر بھی نظر نہ آتی......

آفریں کا وہی چہرہ......

اسکول جانے کی خواہش بالکل ختم ہو گئی تھی، اماں ابا کے ڈر سے جانا پڑتا، وہاں کیا پڑھایا جا رہا تھا، مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔ ماسٹروں کی ڈانٹ بھی بے اثر تھی، میں ایک عجیب قسم کے سحر میں مبتلا تھا جس کے بارے میں خود کچھ نہیں جانتا تھا، دوسروں کو کیا بتاتا۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اب شاید پھوپھی کے ہاں کبھی نہیں جا سکوں گا، گیا بھی تو وہاں جا کر کیا کروں گا۔ رشتہ داری نبھانے کے اور بھی گھر ہیں، رسمی طور پر تو میں کہیں بھی جا سکتا ہوں لیکن وہاں......آفریں کے ہاں محض رسمی طور پر تو ہرگز نہیں جا سکتا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے کسی کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا ہے، کسی مجرم کی طرح۔ لیکن میں اپنا جرم تو جانتا ہی نہیں تھا، شاید میں نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں، میں تو ناکردہ گناہ کی پاداش میں کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا ہوں، کوئی میرے جرم کے بارے میں پوچھے تو میں کیا جواب دوں......؟

شاید میرا دل ہمیشہ کے لئے اچاٹ ہو جاتا، شاید میری پڑھائی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی کہ ایک دن اچانک پھوپھی آ پہنچیں، آفریں ان کے ساتھ نہیں تھی، اماں سے طے ہوا کہ سب حضرت مخدوم الملک کی درگاہ کی زیارت کو جائیں، یہ بھی طے ہوا کہ ایک ٹیکسی لے لی جائے اور گھر بھر اس سعادت میں شریک ہو۔ مجھے اس پروگرام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، میں نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا کہ سارے پروگرام پھیکے ہیں اور مجھے ان میں کوئی حصہ نہیں لینا، لیکن اماں کی ضد......انہیں میرا جانا اس لئے بھی ضروری لگ رہا تھا کہ میں ہفتوں سے اکھڑا اکھڑا رہنے لگا تھا، نہ پڑھنے میں جی لگاتا، نہ کسی کام میں، ہر وقت یونہی پڑا رہتا۔ کھانے پینے سے بھی دلچسپی ختم ہو گئی تھی، جو سامنے آ جاتا، بس وہ کسی طرح کھا لیتا جب کہ میرا کھانا پینا سب کے لئے ایک مسئلہ ہی تھا۔ میری

رغبت اور فرمائش کی چیز سامنے نہ ہوتی تو میں اس کی طرف آنکھیں اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ میری فرمائش زیادہ تر اس وقت ہوتی جب چولہے سرد ہو چکے ہوتے۔ سارے لوگ سمجھا سمجھا کر تھک جاتے، لیکن میں اپنی ضد پر اڑا رہتا۔ آخر اماں ہار مان جاتیں۔

''ستالے رے، ستالے، جب تک اماں زندہ ہے، ستالے، پھر کوئی یہ نخرہ برداشت نہیں کرے گا، یاد رکھنا......''۔

میرے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھل اٹھتی۔

اماں نے جس سختی سے مجھے چلنے کو کہا، اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ انہیں واقعی یقین تھا کہ مجھ پر کسی بدروح کا سایہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اچانک درگاہ شریف جانے کی واحد وجہ میں ہی بنا ہوں۔

وقت مقررہ پر پھوپھی آ گئیں۔ ٹیکسی میں پھوپھا، باجی اور آفریں بھی تھے۔ آفریں کو دیکھ کر میرا دل بلیوں اچھلا ضرور، پھر فوراً ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اماں، ابا اور باجی بھی جا رہے تھے، آفریں سنجیدگی کا مرقع بنی ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے بات بھی نہیں کی، میں اس کی طرف بار بار دیکھتا رہا، دو ایک بار اچٹتی ہوئی نگاہ اس نے مجھ پر ڈالی ضرور، پھر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میرے جی میں آیا کہ میں جانے سے ایک دم انکار کر دوں، میں جانتا تھا کہ میں ضد پر اُتر آؤں تو پھر کوئی مجھے راہ راست پر نہیں لا سکتا۔ میں بھی اماں کو دکھا ہی دوں کہ میں واقعی کسی بدروح کے چکر میں ہوں، لیکن پتہ نہیں کیوں، میں یہ سب صرف سوچ کے رہ گیا اور وہ جو سوڈا واٹر میرے اندر اٹھا تھا، وہ فوراً ہی دب گیا۔

گاڑی میں جگہ کم تھی، مسافر زیادہ۔ پچھلی سیٹ پر تو گھر کے سارے بزرگ تلے اوپر کسی طرح بیٹھ گئے، آگے کی سیٹ پر ڈرائیور کے علاوہ دو جگہیں تھیں، ان پر باجی، آفریں اور مجھے جگہ ملی...... آفریں میری بغل میں، سب کے بدن ایک دوسرے سے بالکل سٹے ہوئے تھے۔

بیٹھتے وقت مجھے ایک ذرا جھجک سی ہوئی، آفریں کے سبب، لیکن اسے شانت دیکھ کر میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی۔

میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بالکل مطمئن اور شانت تھی۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ہمارا اس طرح بیٹھنا گناہ تھا یا ثواب؟

گناہ اور ثواب کا سارا حساب تو آفریں کے پاس تھا اور آفریں......

گاڑی چلتی رہی۔ میرے اندر بے پناہ بھرا ہوا دھواں دھیرے دھیرے نامعلوم راستوں سے نکلتا رہا۔

ہم نے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ شروع باجی نے کیا۔ انہیں باہر کا تیز منظر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے درخت، دوڑتے ہوئے کھیت، تیزی سے اوجھل ہوتے ہوئے مکان اور دوکان، دائیں بائیں، شائیں شائیں نکلتی ہوئی موٹر گاڑیاں، پیدل چلتے ہوئے آدمیوں کے موہوم سائے......

جب میں نے پڑھائی میں دلچسپی چھوڑ رکھی تھی، اس وقت سائنس کی کلاس میں یہی چیزیں پڑھائی جا رہی تھیں، مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، اگر میں سائنسی نقطہ یہاں پیش کرتا تو اس وقت میری کیا دھاک جمتی، خاص طور پر آفریں کے سامنے۔ مجھے افسوس ہونے لگا، میں نے ناحق اپنا وقت ضائع کیا۔ اسکول سے خواہ مخواہ بھاگا بھاگا پھرا۔ باتیں ہوتی رہیں، ان کا کوئی سر پیر نہ بھی ہو پھر بھی ان کا مزا کچھ اور ہی ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب محفل دلچسپ ہو، ماحول پسندیدہ اور مخاطب دل پسند...... میں خوب چہک چہک کر بولتا رہا۔ آفریں بھی بہت خوش تھی۔ کئی بار تو اس نے میری ران پر ہاتھ بھی مارا، چپکے چپکے چٹکیاں بھی لیں، اسے کسی گناہ کا خیال نہیں آ رہا تھا، میں انتظار ہی میں رہا کہ شاید وہ اس سلسلے میں کچھ بولے گی، لیکن نہیں، وہ بہت سی باتیں بولتی رہی، گناہ کی بات تو اس کی زبان پر بھی نہیں آئی۔ میں اس قدر محتاط تھا کہ ایک بار بھی جوابی کارروائی کے طور پر اس کی چٹکی نہیں لی نہ اس کی ران پر ہاتھ مارا۔ اس کی رانیں بہت گداز تھیں، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میری ہڈیوں کے اندر اتری جا رہی ہوں۔ میں ان باتوں کو دل ہی دل میں محسوس کرتا رہا، زبان پر نہیں لایا۔ مبادا یہ لذت مجھ سے چھن نہ جائے۔

ہمارا سفر خوشگوار رہا۔ درگاہ شریف میں بہت بھیڑ تھی، کافی رونق تھی۔ لوگ طرح طرح سے دعائیں مانگ رہے تھے۔ ایک کونے میں کچھ جوان عورتیں بال کھولے گھوم رہی تھیں، کچھ لوگ حضرت کے پائینتی لوہے کے جنگلے سے زنجیروں کے ذریعہ بندھے پڑے تھے، پائینتی جو منقش پائے تھے، وہ چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے چیتھڑوں سے ڈھک گئے تھے اور سب باتیں

سمجھ میں نہ آئیں تو کوئی فرق نہیں پڑا لیکن یہ چیتھڑے......

میں نے چپکے سے باجی سے ان کی بابت پوچھا، انہوں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''منت...... جس کی جو منت ہوتی ہے، وہ اسے گرہ میں باندھ کر پائے میں باندھ دیتا ہے......''۔

اس جواب سے بات واضح نہیں ہوئی، نہ میری تشفی ہوئی، لیکن میں نے جلدی سے اپنا رومال نکالا، اس وقت میں چیتھڑا کہاں سے لاتا، اس پر اپنی منت کی گرہ باندھی اور پائے میں باندھ دیا۔

کون سی منت......؟

یہ تو مجھے خود پتہ نہیں تھا۔ اماں، ابا اور سارے لوگوں نے حیرت سے مجھے یہ سب کچھ کرتے دیکھا۔ آفریں تو مذاق اڑانے والے انداز میں مسکرا رہی تھی لیکن میں سب کی ان دیکھی کرتے ہوئے چپ چاپ کونے میں کھڑا، آنکھیں بند کئے، دعا مانگتا رہا۔

کون سی دعا......؟

مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔

واپسی میں سارے لوگوں نے میرا خوب مذاق اڑایا۔

''کیوں بھائی، کون سی منت مانی تم نے......؟ بڑے خشوع خضوع کے ساتھ اپنا رومال باندھ رہے تھے حضرت کے پائے پر......؟''

''تم نے بتایا کیوں نہیں کہ تم منت ماننے والے ہو، ہم اس کی تیاری کر کے آتے، خواہ مخواہ تمہارا رومال اس میں کام آ گیا......''

''میاں، یوں کام نہیں چلے گا، چالیس روز تک درگاہ شریف میں رہ کے چلّہ کھینچنا ہوگا''۔

''چلّہ......؟؟''

میں بھونچکا ہو کے انہیں دیکھنے لگا، سب ہنسنے لگے۔

''ہاں بھائی چلّہ...... کیوں، ارادہ ہے کیا......؟''

ان لوگوں نے مجھے یوں نشانہ بنا رکھا تھا کہ میں گھبرا کر یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ چلّہ کیا ہوتا ہے۔ اس وقت تو چپ رہنے ہی میں بھلا تھا۔

واپسی میں بیٹھنے کے وہی سلسلے رہے۔ میں اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ میں خاموش تھا لیکن لگ رہا تھا کہ بہت بول رہا ہوں۔ گاڑی کی گڑگڑاہٹ کے درمیان آفریں نے چپکے سے پوچھا۔

''تم نے کیا منت مانی......''۔

''کچھ نہیں......''۔

میں نے سچ سچ بتا دیا، وہ برا مان گئی۔

''نہیں بتانا چاہتے ہو تو مت بتاؤ، میں ضد تھوڑی کروں گی......''۔

میں نے قسمیں کھا کر اسے یقین دلانے کی کوشش کی، وہ مجھے یوں گھورنے لگی جیسے مجھے پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو، پھر آہستہ سے بولی۔

''تو پھر کیا سوچ کر رومال میں گرہ لگائی تھی......؟''

''کچھ سوچ کر نہیں......''۔

میں نے پھر سچ سچ بتایا، اسے پھر یقین نہیں آیا۔ لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔ باجی راستہ بھر اونگھتی رہیں، وہ چاق و چوبند رہتیں تو واپسی بھی باتیں کرتے ہوئے ہی کٹتی۔ آفریں بھی چپ تھی۔ اس نے ایک بار بھی میری چٹکی نہیں لی نہ میری ران پر ہاتھ ہی مارا، البتہ اس کی گداز ران میری ہڈیوں بھری ران سے مل کر ایک انوکھے اور اجنبی مزے کی تخلیق کرتے رہے۔

چائے کے لئے چمپا پور کے ہوٹل پر گاڑی روکی گئی۔ یہاں کی کھیر بہت مشہور تھی، کھانے پینے کی اور بھی نفیس چیزیں ملتی تھیں۔ ابا نے سب کو کھیر کھلائی، چائے پی گئی۔

میں نے باجی اور آفریں کو اشارے سے باہر کے اسٹال پر چلنے کو کہا، وہ جھٹ راضی ہو گئیں۔ میں نے اپنے پیسوں سے ان کو لمکا کی بوتلیں پلائیں اور کیڈ بریز کی ٹافیاں دلائیں۔

''کیوں جی، اتنے پیسے تمہارے پاس کہاں سے آ گئے، کہیں درگاہ کے فقیروں کے تو نہیں مار لئے......؟''

باجی نے اپنی آنکھیں دکھائیں۔ میں نے جلدی سے اپنی صفائی دی۔

''اپنا سارا جمع جتھا لے آیا تھا، مٹی کے دو دو کوزے توڑ ڈالے......''۔

''کس خوشی میں......؟''

باجی نے پھر تیوریاں چڑھائیں لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سب مصنوعی ہے، مجھے زیادہ سوال وجواب میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں مسکرانے لگا۔

درگاہ شریف سے واپس آنے پر اماں نے میرے اندر نمایاں تبدیلی کو محسوس کیا، انہیں لگا کہ شاید میں لوٹ آیا ہوں۔

وہ حضرت کے فیض کی قائل ہوگئیں۔ ادھر میں نے بھی اتنے جھٹکوں کے بعد احتیاط برتنا شروع کردیا، تنہا وتنہا وہاں جانے کا خیال فی الحال دل سے نکال دیا اور اماں کے لئے پھر دوڑ دوڑ کر رکشہ لانے لگا۔ میں آفریں کے زیادہ نزدیک بیٹھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا حالانکہ وہ کبھی کبھی بالکل قریب آبیٹھتی، اس دم میں ایک دم بے نیاز بن جاتا۔ اس ڈر سے کہ کہیں پھر اسے گناہ ثواب کا خیال نہ ستانے لگے، لیکن بھابھی کو پتہ نہیں ہم سے کیا دشمنی تھی کہ ہمارا سکون اسے ایک آنکھ نہ بھایا۔

اتفاق سے آفریں اس روز میرے کافی قریب بیٹھی تھی اور ہم ایک دوسرے میں گم کہانیوں کے آدان پردان میں مصروف تھے کہ وہ نہ جانے کہاں سے آٹپکی، پہلے تو اس نے ہمیں یوں دیکھ کر خاص انداز سے اپنی تیوریاں چڑھائیں، پھر اپنی وہی...... سمجھ میں نہ آنے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''اتنا سٹے کیوں بیٹھے ہو تم لوگ......؟ بہت اچھا لگ رہا ہے کیا......؟''

آفریں تو یہ سن کر فوراً کھڑی ہوگئی۔ ایسا لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو، میری سمجھ میں بھابھی کا سوال آیا نہ آفریں کی گھبراہٹ، میں حیران نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا۔

آفریں کے کپکپاتے ہونٹوں کو دیکھ کر بھابھی نے فوراً پینترہ بدلا۔

''ٹھیک ہے میں کسی سے نہیں کہوں گی، لیکن میری ایک شرط ہے......''۔

''کون سی شرط......؟''

میرے اور آفریں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

''تم آپس میں کیا باتیں کرتے ہو، مجھے بھی بتاؤ......''۔

بھابھی نے بڑی لاپروائی سے اپنی شرط بتائی۔

''باتیں......؟؟''

ہم تو یہ سن کر چکرا ہی گئے۔ ہم بات کہاں کرتے تھے، ہم تو صرف کہانیاں...... بھابھی

کہانیاں سننا چاہے تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا، ہم نے سچ سچ بتا دیا، اسے بالکل یقین نہیں آیا۔

''بے وقوف بناتے ہو...... دنیا بھر سے دور، تنہائی میں ڈھیرے ڈھیرے تم صرف کہانیاں کہتے ہو......؟''

اس نے اپنی آنکھیں لال پیلی کرلیں۔ میں نے سوچا قسمیں کھا کر اسے یقین دلا دوں، اس وقت آفریں کو کیا ہوا کہ وہ چیخ پڑی۔

''بھابھی......!''

بھابھی کے چہرے پر حیرانی کا ایک سایہ سا لہرایا۔ وہ ہنس کر بولی۔

''چوری پکڑی گئی ہے تو غصہ ہو رہی ہو، ارے بھائی میں تمہاری دشمن تھوڑی ہوں، تمہاری کچھ مدد ہی کردوں گی......''۔

آفریں دھم سے بیٹھ گئی لیکن مجھ سے دور، اور اپنے آپ پر قابو پا کر بولی۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے بھابھی، ہم کوئی بات نہیں کرتے، بس کہانیاں کہتے ہیں......''۔

''کون سی کہانیاں......؟''

بھابھی نے ایک عجیب انداز سے اپنے ابرو چڑھائے۔

''وہی جو نانی، دادا اور خالہ سے سنتے ہیں...... یہ بھی وہی کرتا ہے......''۔

آفریں اس وقت صلح کے موڈ میں تھی، اس نے میری صفائی بھی دے دی۔

''ہاں جی......؟''

بھابھی نے تیکھے انداز میں مجھ سے پوچھا، میں نے جلدی سے جواب دیا۔

''جی بالکل......''۔

''ٹھیک ہے، تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں، اگر کبھی پکڑے گئے تو پھر سمجھ لینا......''۔

وہ گویا دھمکی دے کر چلی گئی، ہم گم صم سے رہ گئے۔ بہت دیر تک فضاؤں ہی تھمی رہی۔ میں نے خاموشی کی اس چادر کا ایک کونہ اُٹھانے کی کوشش کی۔

''اب کیا ہوگا......؟''

اس نے غور سے مجھے دیکھا، دیکھتی رہی، کچھ بولی نہیں، پھر اٹھ کر پھوپھی کے پاس چلی

گئی۔ فضا اور خاموش ہو گئی اور میں اس میں مکمل طور پر کھو گیا، اگر ماں رکشہ لانے کو نہ کہتیں تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔

اماں نے کئی روز تک مجھے گم صم دیکھا تو وہ پھر درگاہ شریف کی زیارت کا پروگرام بنانے لگیں، لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گا اماں، میں بالکل ٹھیک ہوں، وہ...... امتحان سر پر آ پہنچا ہے نا اس لئے......''۔

اماں کس حد تک مطمئن ہوئیں، میں نہیں جانتا، لیکن یہ حقیقت تھی کہ میں نہ صرف باہر بلکہ اندر سے بھی گم صم ہو کر رہ گیا تھا، امتحان تو واقعی سر پر آ گیا تھا لیکن پڑھنے کی طرف میرا دل مائل ہی نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اس کی فکر بھی نہیں تھی کہ پاس کروں گا یا فیل، فیل ہی کر جاؤں گا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا دماغ ایک صاف سلیٹ بن چکا ہے، اس قدر چکنا کہ اس پر کچھ لکھاوٹ نہیں ہو سکتی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں نے ایسا کون سا کام کیا ہے کہ بار بار میری دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں تھا۔

اور پھر میں اپنا غم تو پی بھی سکتا تھا، بھابھی ہر وقت اس کے گھر میں رہتی ہے، کچھ الٹی سیدھی پھوپھی سے جڑ دیا تو آفریں کا کیا ہوگا۔ پھر تو وہ کبھی مجھ سے بات بھی نہیں کرے گی، اس بات کا تصور ہی میرے لئے کتنا سوہان روح تھا، مجھ سے زیادہ کون جانتا تھا۔

اس اندھیر نگری میں بہت دن بیت گئے۔

پتہ نہیں کن وقتوں کا کچھ پڑھا کام آ گیا کہ میں فیل نہیں ہو سکا۔ نمبر معمولی آئے لیکن پاس کر گیا۔ اس سے میرے دماغ کے سلیٹ کی چکنائی کچھ کم ہوئی اور اس پر کچھ مٹے مٹے سے حروف اُبھرنے لگے۔ میں نے اپنے آپ کو ہر چہار طرف سے کاٹ کر بس اس سلیٹ پر جھکا لیا۔ حالانکہ اس وقت یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔

اسکول کی پڑھائی آگے نکل گئی تھی اور میں پیچھے رہ گیا تھا، چنانچہ اس نقصان کو بھرنے کے لئے فوراً کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔ ایک بہت اچھے ٹیوٹر کا پتہ چلا کہ وہ اگر پڑھا دیں تو شاید بھرپائی ہو جائے۔ لیکن مشکل یہ آ پڑی کہ وہ آفریں کے مکان سے آگے کچھ فاصلے پر رہتے تھے۔ وہاں جاؤں تو روز اس کی دہلیز کو پھلانگ کر جاؤں، نہ جاؤں تو اپنا نقصان۔ یوں ہمارے درمیان

رشتہ منقطع نہیں ہوا تھا۔ اماں جاتی ہی تھیں، پھوپھی بھی آتیں، لیکن میں اس وقت باہر چلا جاتا، اس کو کسی نے نوٹ کیا تھا یا نہیں، میں نہیں جانتا۔ کیا تھا تو کسی نے مجھ سے پوچھا نہیں۔ مجھے اچھی طرح پتہ ہوتا کہ آفریں بھی آئی ہے، پر میں کیا کر سکتا تھا، جس دم وہ مجھے چپ چاپ چھوڑ کر گئی تھی اس دم سے مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ہمارے درمیان ایک ایسی دیوار اٹھ گئی ہے جس نے ہمیں بالکل الگ کر دیا ہے، ہماری زبانیں الگ ہو گئی ہیں، ہماری نگاہیں بہت دُور چلی گئی ہیں۔ آفریں سے سامنا ہو جاتا تو کیا ہوتا، نہ وہ کچھ بول پاتی، نہ میں بول پاتا، نہ وہ مجھے دیکھتی نہ میں، پھر خواہ مخواہ کا آمنا سامنا کس واسطے......؟

رفتہ رفتہ میں نے اپنے دل کو کٹھور بنا لیا، ٹیوٹر کے ہاں مجھے جانا ہی تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھا لیا کہ درمیان کسی کا گھر آنے سے کوئی فرق کیوں پڑنے لگا، راستے میں تو بہت سے گھر آتے ہیں، ان گھروں میں ایک گھر وہ بھی ہے اور بس۔

اماں نے مجھے سائیکل لے دی تھی۔ وہاں سے گذرتے وقت میں اتنی تیزی سے پیڈل مارتا کہ نہ صرف وہ مکان بلکہ سارے مکانات پنسل سے کھینچی ہوئی آڑی ترچھی لکیر نظر آتے، اسی طرح واپس بھی آتا، اس بے تحاشہ تیزی سے کئی بار حادثوں سے بھی دوچار ہوا، ہاتھ پیر پر زخم بھی آئے لیکن مجھے کچھ پروا نہیں تھی۔ میرے اندر جو مہلک زخم پک رہا تھا، اس کی ٹیس کے آگے ان زخموں کی کیا حیثیت تھی۔ کچھ دنوں کے بعد میرے اندر کا طوفان کسی حد تک کم ہوا، سائیکل چلانے کا انداز کچھ نارمل ہوا۔ کبھی کبھی مکان کی طرف اچٹتی ہوئی نگاہ بھی ڈال لیتا۔ کوئی نظر نہ آتا تھا، ہاں مجھے کسی نے کہیں سے دیکھا ہو تو دوسری بات ہے۔

ایک دن اچانک نگاہ اٹھی تو آفریں چھت پر کھڑی تھی۔ وہ مجھے پہلے سے دیکھ رہی تھی یا اس وقت اس کی نگاہیں اٹھیں، کہنا مشکل ہے لیکن غیر ارادی طور پر...... بالکل غیر ارادی طور پر میری سائیکل رک گئی۔ میں ہزار پیڈل مار رہا ہوں، وہ چلتی ہی نہیں۔ اس عالم میں اس نے مجھے اشارہ کیا اور نیچے اترنے لگی۔

میں دم بخود کھڑا رہا۔ اس وقت میرے اندر کی وہ سلیٹ پھر صاف ہو گئی جس پر میں نے بڑی مضبوطی سے اپنے ارادے لکھے تھے اور لکھے ہوئے پر کئی بار چاک پھیرا تھا کہ وہ پختہ ہو جائیں۔

وہ آ گئی۔ اتنے دنوں میں وہ کتنی بڑی ہوگئی تھی، اپنی آنکھوں پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں اس کے سامنے کتنا چھوٹا لگ رہا تھا۔ وہ عجیب انداز سے مسکرائی۔

''ناراض ہو......؟''

''نہیں......''۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ یہ تو واقعہ تھا کہ میرے اس کے درمیان ناراضگی کی کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا، اس کا کوئی سر پیر ہی نہیں تھا، کچھ انہونی سی تھی جو اچانک پانی کے بلبلے کی طرح ختم ہوگئی۔

''گھر چلو......''۔

اس کے حکم پر میں سب کچھ بھول کے سحر زدہ سا اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ پھوپھی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

''بہت دنوں کے بعد آیا ہے میرا لاڈلا...... کیوں رہے، پھوپھی کی یاد بھی نہیں آتی......؟''

''آج کل پڑھائی میں بہت لگا ہوا ہے......''۔

آفریں نے میری طرف سے جواب دیا۔ پھوپھی نے میری جیب میں سوکھے میوے بھر دیئے اور جب وہ باورچی خانے میں چلی گئیں تو اس نے مجھے دالان کی طرف چلنے کا اشارہ کیا جو ہمارا مخصوص اڈا تھا۔ میں نے خوف زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا، وہ چپکے سے بولی۔

''بھابھی میکے گئی ہوئی ہے......''۔

میری جان میں جان آئی اور میں اس کے ساتھ بلا جھجک چلا گیا۔

''بڑے بدھو ہو......''۔

اس نے میرے گال میں اتنی زور سے چٹکی لی کہ میں درد سے بلبلا اٹھا۔ میرا سارا بدن جھنجھنا گیا۔ بدھو ہونے کا میں اقرار کر سکتا تھا نہ انکار، دونوں میں اپنی شکست تھی، میں چپ چاپ اپنا گال سہلاتا رہا جس پر یقیناً سرخ نشان پڑ گیا ہوگا۔

''اچھا سنو، بھابھی بہت دنوں کے لئے میکے گئی ہے، تم بلا خوف وخطر آ سکتے ہو......''۔

اس نے بڑی دل خوش کن اطلاع دی۔ میں نے شرماتے ہوئے اسے بتایا کہ میں اس

کے بغل ہی میں پڑھنے آتا ہوں اور روزانہ......

وہ بڑی دل آویزی سے مسکرائی اور شوخ لہجے میں بولی۔

''مجھے پتہ نہیں ہے کیا......؟ تب ہی تو میں نے تمہیں بدھو کہا، لیکن یہ بتاؤ کہ میرے گھر سے گزرتے وقت تم اس قدر تیزی کیوں دکھانے لگتے تھے......؟ ڈر تھا کہ پکڑ لئے جاؤ گے، ایں......؟''

میری پیشانی پر بہت بے قراری سے پسینے کے ننھے ننھے قطرے اُبھر آئے۔ اس کی اکثر باتوں پر میری یہ حالت ہو جایا کرتی تھی، پتہ نہیں کیوں......؟ وہ بھی شاید میری پریشانی کو سمجھتی تھی اس لئے فوراً ہی دوسری طرف مڑ جایا کرتی۔ اس وقت بھی اس نے یہی کیا۔ کہانیوں کا سلسلہ فوراً شروع کر دیا، میرے ہاتھ بالکل خالی تھے۔ میرے پاس تو کوئی کہانی تھی ہی نہیں، اس عرصے میں میں نے کوئی کہانی حاصل کہاں کی تھی۔ پہلے تو دادی سے ضد اور فرمائش کر کے سنتا لیکن ایک وقت آیا جب دادی کہانی سننے کو بلاتی تھیں اور میں نہیں جاتا تھا۔ میں کس کے لئے کہانی سنتا، مجھے اپنے لئے تو کہانی چاہئے نہیں تھی، میرے لئے تو آفریں کہانی سنتی ہی تھی۔

آفریں نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔

''کیا واقعی......؟ سچ مچ تمہارے پاس کچھ نہیں......؟''

میری خاموشی مجرمانہ تھی۔ اس نے پھر سنبھالنے کی کوشش کی۔

''چلو، پرانی کہانیوں ہی میں سے کچھ......''۔

میرا ذہن اس کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ ابھی اچانک جو بدحواسی مجھ پر طاری ہوئی تھی، اس سے میری ساری یادیں بھی سادہ سلیٹ کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔

میں حونق کی طرح اس کا منہ دیکھتا رہا، اسے بھی غصہ آ گیا۔

''منہ کیا دیکھ رہے ہو، میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنے بڑے بدھو ہو، خیر جاؤ اور آئندہ کہانیاں لے کر آنا اور بہت جلد''۔

جان بچی سو لاکھوں پائے...... میں وعدہ وعید سے لدا پھندا بھاگا بھاگا ٹیوٹر کے ہاں پہنچا تو وہ اپنا بوریہ جھاڑ چکے تھے، سچ مچ کا بوریہ جس پر بیٹھ کر وہ پڑھاتے تھے، انہوں نے مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

''کیوں میاں، یہ کیا حرکت......؟ تم تو وقت کے بڑے پابند تھے......''۔

''جی......وہ کیا ہے کہ......دراصل......''۔

جلدی میں مجھے کوئی معقول جھوٹ بھی نہیں سوجھا اور میں ہکلا کر رہ گیا۔

''نقصان تو تمہارا ہوا نا، اور تو کسی کا کچھ نہیں بگڑا، اب جاؤ، کل آنا اور ہاں پڑھائی کو سبقت نہیں دو گے تو اس سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکو گے......''۔

وہ بڑی بیزاری سے بولے، میں نگاہیں نیچی کئے کھڑا رہا اور دونوں طرف اپنا نقصان اٹھا کے واپس آ گیا۔ اس دن رات میں، میں دادی کے سر ہو گیا کہ آج ایک نہیں، کئی کہانیاں سنانی ہوں گی، انہوں نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔

''کیوں، بات کیا ہے؟ کوئی خالی خزانہ ہاتھ لگا ہے جس کا منہ بھر دینا چاہتے ہو؟''

''یہی سمجھ لیجئے دادی ماں، لیکن کہانی......''۔

اور دادی ماں کے پاس کہانیوں کی کون سی کمی تھی، بس سننے والا تحمل کے ساتھ بیٹھا رہے۔ وہ رات بھر کہانیاں کہہ سکتی تھیں۔ انہیں ویسے بھی نیند کم آتی، چنانچہ وہ شروع ہو گئیں۔

ایک کہانی......

دوسری......

تیسری......

ٹیوٹر کے ہاں جانا اب ایک بہانہ بن کر رہ گیا تھا، وہاں پڑھائی تو صرف ایک گھنٹہ ہوتی تھی لیکن سارے عمل میں کل ملا کر تین چار گھنٹوں سے کم نہیں لگتے تھے۔ بھابھی کے نہیں رہنے کے سبب میدان بالکل صاف تھا۔ آفریں باہر ہی کھڑی ملتی، ہم باہر ہی مل لیتے، وہ مجھے اندر جانے کو منع تو نہ کرتی لیکن جانے کو بھی نہ کہتی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ پھوپھی سے ملے بغیر آنا اچھی بات نہیں ہے، لیکن پھوپھی اس کی اماں تھیں، گھر بھی اس کا تھا، اس لئے کیا مناسب ہے کیا نہیں یہ میں نے مکمل طور پر اس پر چھوڑ دیا اور اپنے طور پر بالکل بری الذمہ ہو گیا۔ ایک روز بہت دھیمی آواز میں، نگاہیں نیچی کئے اس نے کہا۔

''تمہارا روز روز یہاں آنا مناسب نہیں......''۔

میں گھبرا گیا۔

''کیا بھابھی......؟''

''نہیں وہ ابھی نہیں آئی، پھر بھی......''۔

وہ چپ ہوگئی، میں اس کی طرف دیکھتا رہا، ایسا لگ رہا تھا اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے، لیکن وہ کہہ نہیں پا رہی۔ دیر تک وہ کچھ نہیں بولی۔ تب میں نے آہستہ سے کہا۔

''کیوں مناسب نہیں ہے، تم زیادہ جانتی ہوگی لیکن میں تو پڑھنے آتا ہوں اور روز تمہارے گھر سے گزرتا ہوں......''۔

''تو پھر......؟''

اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میں کیا کہنا چاہتا تھا۔ شاید میں خود نہیں جانتا تھا، اس لئے میں چپ رہا۔ وہ میرے کچھ کہنے کی منتظر رہی۔

ہم کافی دیر تک چپ چپ سے رہے۔ اچانک اس کی آنکھوں میں روشنی کا ایک جھما کا سا نظر آیا لیکن اس نے فوراً کچھ نہیں کہا، شاید وہ کچھ سوچ رہی تھی اور کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتی تھی۔ پھر شاید وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی اور سمجھانے والے انداز میں مجھ سے بولی۔

''دیکھو، جو کچھ میں کہہ رہی ہوں، غور سے سننا، برا مت ماننا، تم ممانی کے ساتھ جس طرح آتے ہو، آتے رہو گے، اس میں تمہیں کوئی نہیں روکے گا......''۔

''تو کیا ابھی کسی نے روک لگا دی ہے......''۔

میں نے درمیان میں اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

''نہیں...... کسی نے نہیں روکا۔ بہت سی باتیں کہی نہیں جاتیں، سمجھی جاتی ہیں۔ آگے میری بات سنو۔ کل سے تم اِدھر سے گزرو گے تو میں تمہیں نظر نہیں آؤں گی، تم بس یہ کرنا کہ ان اینٹوں کے درمیان ایک کاغذ پر اپنا دستخط کر کے اس میں رکھ دینا......۔

اس نے دیواروں کے بیچ دو اینٹوں کے درمیان ایک چھوٹی سی جگہ دکھائی جس میں ایک چھوٹا سا پرزہ ہی گھس سکتا تھا......۔

یہ کیا بات ہوئی......؟

اس سے کیا ہوگا......؟

میں بے دلی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے شاید میرے دل کی بات سمجھ لی اور

میری دل جوئی کرتے ہوئے بولی۔

''تم اس پرزے میں کچھ لکھنا چاہو تو ضرور لکھ دینا...... دو چار جملے......''۔

میں پھر بھی نہیں سمجھا، پہلے اس نے صرف دستخط کرنے کو کہا، پھر دو چار جملے بھی...... آخر مطلب کیا ہے......؟

''ان سب سے کیا ہوگا......؟''

میں نے یونہی پوچھ لیا، میری بددلی برقرار تھی۔ وہ مسکرائی۔

''ہوگا یہ کہ مجھے ہر بار تمہارے آنے کی خبر مل جائے گی، یہ دیکھ کر مجھے اچھا لگے گا کہ تم مجھے بھول نہیں رہے......''۔

مجھے اس کی یہ بات بڑی احمقانہ لگی۔

بھابھی موجود نہیں تھی اور میں آسانی کے ساتھ آ جا رہا تھا، اس کی خاطر میں نے اندر جا کر پھوپھی سے ملنا بھی چھوڑ دیا، اب وہ خود ہی روک لگا رہی ہے، اس پر سے خواہ مخواہ کی ڈرامہ بازی......۔

لیکن میں کیا کر سکتا تھا، کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس کے ساتھ جب بھی معاملہ ہموار ہوتا، کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہو جاتی جس سے گاڑی اُلٹی پٹری پر کھڑی ہو جاتی۔ غنیمت تھا کہ اس نے خود ہی کچھ کمزور ڈوریاں لٹکا دی تھیں جنہیں پکڑے رہنا اب میری مجبوری تھی۔

بازار سے عمدہ قسم کا چمکدار سفید کاغذ خریدا، اس کو چوکور در چوکور کر کے پرزے بنائے، سب پر اپنے دستخط ثبت کئے اور اینٹوں کے درمیان رکھنے لگا۔ دستخط کے نیچے تاریخ اس دن کی ڈالتا جس دن پرزہ رکھتا۔ پابندی سے یہ کام ہوتا رہا۔ ان باتوں کا کوئی جواز میری سمجھ میں نہ آتا تھا، اس نے کہا تھا اس لئے میں کئے جا رہا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ کوئی پیغام دینا ہو تو...... لیکن مجھے کیا پیغام دینا تھا......؟

اس درمیان اماں کے ساتھ آنا جانا جاری رہا، وہ بھی پھوپھی کے ساتھ آتی رہی۔ کہانیوں کے آدان پردان کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ یعنی ایک ساتھ دو محاذوں پر میں اس کے ساتھ ڈٹا ہوا تھا۔

ایک دن اس نے کہا۔

''دیکھو، آگے جا کر، پڑھ لکھ کے انجینئر بننا......اچھا......''۔

میں نے فوراً حامی بھر لی۔

''ضرور بنوں گا......''۔

حالانکہ انجینئر بننے کے بارے میں، میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا، ابھی تو مجھے ہائی اسکول پاس کرنا تھا۔ کبھی کبھی ذہن میں ڈاکٹر بننے کا خیال ضرور آتا، اب اس نے کہہ دیا تو میں انجینئر بننے کی لائن پر سوچنے لگا۔

کافی عرصہ میکے میں رہنے کے بعد بھابھی واپس آگئی۔ آفریں نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے خبردار کر دیا۔

''کچھ زیادہ ہی بدمعاش بن کر آئی ہے......''۔

''یعنی......؟''

میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''بس کوئی نہ کوئی بات نکالتی رہتی ہے......''۔

آفریں کو اس کے کچھ بولنے سے کیا ہو جاتا ہے۔ صرف کوئی نہ کوئی بات نکالنے سے وہ بدمعاش کیسے ہو گئی......؟

''مارتی تو نہیں ہے نا......؟''

میرے منہ سے نکل گیا۔ وہ مجھے گھورنے لگی، شاید میں نے کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی تھی۔ میں دیر تک اس کے کچھ کہنے کا انتظار کرتا رہا۔ بہت دیر کے بعد وہ بولی بھی تو بس یہ......

''تم واقعی بدھو ہو......''۔

ایک دن کہانی کہتے کہتے پتہ نہیں کیسے اس کے کرتے میں ایک کیڑا گھس گیا۔ وہ سخت بے چین ہو گئی اور اس کیڑے کو کبھی باہر، کبھی اندر سے بھگانے کی مسلسل کوشش کرتی رہی لیکن بے سود۔ مجھ سے اس کی پریشانی دیکھی نہ گئی اور میں نے جلدی سے اس کے گریبان میں پیچھے سے ہاتھ ڈال کر اس کی پیٹھ پر چپکے ہوئے کیڑے کو پکڑ لیا۔ ابھی میں کیڑے کو پکڑ کر باہر لا ہی رہا تھا کہ اچانک کسی نے میری کلائی کو مضبوطی سے دھر لیا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا تو بھابھی اپنی سمجھ میں نہ آنے والی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔

''ہوں.....تو معاملہ یہاں تک آ پہنچا ہے.....''۔

آفریں کا چہرہ دھواں سا ہو گیا، میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، میں نے جلدی سے کہا۔

''کیڑا تھا.....آفریں کے کرتے میں گھس گیا تھا.....''۔

''اس کے بعد پھر تم گھس گئے.....''۔

اس کی آواز میں غراہٹ تھی۔ میرے جسم میں ایک سنسناہٹ سی پھیل گئی، میں نے اسے پھر یقین دلانے کی کوشش کی۔

''قسم خدا کی، کیڑا تھا، آفریں کو بہت پریشان کر رہا تھا، آپ اس سے پوچھئے نا.....''۔

آفریں کاٹھ کی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ سے نہ ہوں نکلا نہ ہاں نکلا، بھابھی تھی کہ میری کلائی چھوڑ ہی نہیں رہی تھی بلکہ اس کی گرفت اور مضبوط ہوتی جا رہی تھی، اس ہڑ بڑاہٹ میں وہ ذلیل کیڑا کب کا آزاد پنچھی بن چکا تھا، حالانکہ اسے مار ڈالنے کا میں نے پختہ ارادہ کر رکھا تھا۔

''چلو، اماں کے پاس، وہیں اپنی صفائی دینا.....''۔

وہ مجھے کھینچنے لگی۔ میں نے بڑی بے بسی سے آفریں کو دیکھا، اس کے ہونٹوں پر تھرتھراہٹ سی نمودار ہوئی، وہ کانپتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

''اسے چھوڑ دیجئے بھابھی۔ اماں سے کیا کہئے گا، اس نے کچھ کیا ہو تب تو.....''۔

''یعنی آنکھوں دیکھی مکھی نگل جاؤں، جو کبھی اماں کو معلوم ہو گیا اور انھوں نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تمہارا کیا فرض تھا تب میں کیا جواب دوں گی.....؟''

بھابھی عجیب سفاکانہ انداز میں تن گئی۔ میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا، اس کے چہرے پہ ہنسی کا دُور دُور تک کوئی نشان نہیں تھا، حالانکہ ابھی جب وہ نظر آئی تھی تو ہنسی کی ایک لکیر وہاں تھی۔

آفریں سچ کہتی تھی.....بدمعاش.....

''دیکھئے، خدا کے واسطے بات مت بڑھائیے، آخر کون سی مکھی نگل گئیں آپ.....؟ آپ کے دماغ میں خود فتور بھرا ہوا ہے اس لئے.....''۔

آفریں بھی تن کے کھڑی ہو گئی، غصہ کے مارے اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔

''اچھا.....رنگے ہاتھوں پکڑا گئی ہو اس لئے بہت تن تنا رہی ہو، یہ تیور اماں کو دکھانا، میں یہ سب برداشت نہیں کرنے والی.....''۔

آج تو بھابھی واقعی لڑنے کے موڈ میں تھی۔ اس کی ساری ہنسی زہرناکی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ ادھر آفریں بھی اس سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ دونوں کے درمیان میں پھنسا ہوا تھا، سو میں نے آزاد ہونے کی کوشش کی اور بھابھی کا ہاتھ زور سے اینٹھ کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا، اس نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تو میں نے اسے یوں جھٹکا دیا کہ وہ بستر پر جا گری۔ میں بھاگ کر چلا آیا۔

دوسرے روز اینٹوں کے درمیان مجھے ایک پرزہ ملا۔ آفریں کا......

''بھابھی نے اپنا شیطان چہرہ دکھا دیا۔ اماں سے اس نے ایسی ایسی باتیں جڑیں کہ بس کچھ پوچھو مت۔ میں نے رو رو کر بہت قسمیں کھائیں، اماں کچھ بولیں تو نہیں لیکن کل سے چپ چپ ہیں، فی الحال سب کچھ بند...... ملنا بھی...... پرزہ بھی......''۔

میری مٹھی میں میرا دستخط شدہ پرزہ، جس پر میں نے آج ہی کی تاریخ ڈالی تھی، پھڑ پھڑاتا رہا اور مٹھی کے اندر اندر پھوٹنے والا پسینہ اس کا گلا گھونٹتا رہا۔

میں نے بار بار آفریں کا پرزہ پڑھا۔

یہ اس کی پہلی تحریر تھی جو میرے ہاتھوں میں تھی۔ ٹیڑھے میڑھے، اوپر نیچے تحریر کے درمیان اس کا ستا ہوا چہرہ بار بار نظر آ جاتا اور میرے دل میں کوئی سسکیاں لیتا۔

میں رو نہیں رہا تھا، رونے کی کوئی وجہ تو نہیں تھی، البتہ ہنسی بھی مجھ سے کوسوں دور تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے اب وہ کبھی میرے پاس نہیں آئے گی۔ میری کیفیت اس بھولے بھالے مسافر کی ہوگئی تھی جو بہت خوش خوش، مستقبل سے بے خبر، پہاڑی راستوں پر چلا جا رہا ہے۔ ہر چہار طرف سرسبز وادیاں، خوشبو اور خوبصورتی سے دم دم کرتے ہوئے پھول، شاداب پہاڑی، خوشنما پرندوں کی چہچہاہٹ، خوبصورت کیاریوں جیسا راستہ کہ اچانک...... بس اچانک...... اگلا قدم کھائی میں ہوتا، آگے بہت گہری، تاریک کھائی تھی، وہ فوراً رک نہ جاتا تو کھائی یقیناً اس کا مقدر ہوتی اور......

آفریں سے اب پیغام رسانی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ کوئی بات ضروری ہو تو پرزے پر لکھ دینا، مجھے یہ بات کتنی احمقانہ لگی تھی، اب جب کہ میں کچھ کہنا چاہ رہا ہوں تو ہر طرف کے راستے بند ہیں، کتنی اہم بات کہی تھی اس نے، میں نے فائدہ نہیں اٹھایا، کم سے کم اس سے یہ تو پوچھتا کہ اب آگے کیا ہوگا......؟

میں نے اس کے مکان سے گزرتے وقت پھر وہی رویہ اختیار کر لیا، خوب تیزی سے

سائیکل کو بھگا لے جاتا۔ اماں نے پھوپھی کے ہاں چلنے کو کہا تو پڑھنے کا بہانہ کر دیا...... ہاں بہانہ...... پڑھنے میں جی کس کم بخت کو لگ رہا تھا، ٹیوٹر صاحب کے ہاں بھی اس لئے جاتا تھا کہ درمیان آفریں کا مکان پڑتا تھا، بھلے وہاں رکنا نہیں، آنکھیں اٹھا کر دیکھنا بھی نہیں، لیکن آفریں کا مکان تو تھا اور بس۔

ایک عجیب بے کلی سی تھی، پتہ نہیں مجھے کوئی بیماری ہو گئی تھی یا کیا معاملہ تھا، کسی پل چین نہیں، اس معاملے میں اتنا اُتار چڑھاؤ کیوں ہوتا رہتا تھا، آفریں سے ملنا، اس کے ساتھ بیٹھنا، اس سے باتیں کرنا مجھے بہت اچھا لگتا تھا بس اتنی ہی سی تو بات تھی۔

نیند آتی ضرور لیکن ایسی کہ اس سے نہ آنا زیادہ بہتر۔ سات گھنٹے میں کچھ نہیں تو پندرہ بیس بار ضرور ٹوٹتی ہو گی اور ایک بار جو ٹوٹی تو پھر کاہے کو فوراً آئے گی۔ پتہ نہیں کیا سوچتا رہتا، کوئی ایک نقطہ تو تھا نہیں، ایک قوس و قزح سی تھی جس کے چاروں طرف میری سوچ منڈلاتی رہتی۔ بھوک بھی نہیں لگتی تھی، جیسے تیسے کھا لیتا تھا اس ڈر سے زیادہ کہ اماں جان کو آ جائیں گی، طرح طرح کے سوالوں کی بوچھار، پتہ نہیں کس سوال، کس جواب سے وہ کس نتیجے پر جا پہنچیں اور جو کچھ نہیں ہوا وہ سب ہونے لگے۔

کسی نئے محاذ کو میں ہرگز نہیں کھولنا چاہتا تھا، پہلے ہی بہت بھگت چکا تھا۔

اس دن کیسے اینٹوں کے بیچ بے ارادہ میری نگاہیں اٹھ گئیں۔ اس میں رکھا ہوا پرزہ بھی مجھے نظر آ گیا۔ میں نے جلدی سے سائیکل روکی، بہت احتیاط کے ساتھ پرزہ اپنی مٹھی میں بند کیا اور سائیکل پر پھر تیز پیڈل ماری۔ لکھا تھا۔

''کل رک جانا...... بھابھی نہیں ہے......''۔

میرا دل بلیوں اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہاں سے وہاں تک جو آگ لگی تھی، وہ اچانک شبستان میں بدل گئی۔ اس دن مجھے کھانا بھی اچھا لگا اور نیند بھی گہری آئی۔

آفریں گھر کے باہر ہی کھڑی تھی۔ اتنے دنوں میں کیا ہوا تھا کہ وہ بالکل جوان دکھ رہی تھی۔ میں اس کے سامنے اور بچہ نظر آ رہا تھا، اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور ایک چھوٹی سی پوٹلی میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولی۔

''دیکھو لو، اس میں تمہارے سارے پرزے موجود ہیں، میں نے بہت احتیاط سے رکھے

تھے، تاریخ وار ملالینا......''۔

''کیوں......؟''

میں بھونچکا سا اسے دیکھنے لگا۔

''میری شادی ہو رہی ہے نا، اس لئے......''۔

''شادی......؟؟؟''

میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر کچھ دکھائی نہیں دیا، لیکن میں اس کے چہرے پر کیا دیکھنا چاہتا تھا......؟

تو آفریں کی شادی ہو رہی ہے......؟

شادی کے بعد تو وہ اپنے دولہا کے گھر چلی جائے گی، پھر اس سے ملاقات بھی نہیں ہوگی، یہ پوچھنا بھی بیکار رہی تھا کہ اس کی شادی کہاں ہو رہی ہے، اس شہر میں ہو رہی ہو گی تو کیا میں اس سے مل سکوں گا......؟

ایک لمحے میں......بس ایک لمحے میں دنیا بھر کی باتیں مجھے سوجھنے لگیں، باتوں کا جیسے ایک جھکڑ چلنے لگا، آخری بات یہ تھی کہ میں اسے جی بھر کے دیکھ تو لوں، پھر کبھی ایسا موقع ملے نہ ملے۔ ابھی میں نے اسے دیکھنا شروع ہی کیا تھا کہ وہ جانے کے لئے مڑ گئی، میں وہیں پر کھڑا رہا، جاتے جاتے وہ پھر مڑی اور میرے پاس آکر بولی۔

اور ہاں......اب تمہیں انجینئر بننے کی ضرورت نہیں، تم جو چاہو بن جانا، خدا حافظ......''۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی، میرے کچھ بولنے کا انتظار کئے بغیر اندر چلی گئی۔

میری زبان گنگ تھی۔

اور میں وہاں دیر تک کھڑا اس خوشبو کو اپنے نتھنوں میں بھرنے کی کوشش کرتا رہا جس کے دوش پر ہوا کے جھونکے کی طرح وہ گزر گئی تھی۔

کبھی واپس نہیں آنے کے لئے......۔

✠ • ✠ • ✠